سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

سیرت طیبہ

قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

REGD. No. D. 586 REGD. No. D. 586

سہ روزہ "دعوت" دہلی کی خصوصی پیشکش

سیرت طیبہ

مرتب کرنے والے

اکرام احمد خاں ——— محمد مسلم

جلد نمبر ۷	۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء	۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ	شمارہ نمبر ۸۱

محمد مسلم ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر سہ روزہ دعوت محلہ کشن گنج سے شائع کیا۔

20.9.57

1861 1861

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

(اقبال)

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

گزارشات

ادارہ

سہ روزہ دعوت کی یہ خصوصی پیشکش کم و بیش ۸، ۱۰ ہفتوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ہمارا خیال تھا کہ اسکی ضخامت ڈیڑھ سو صفحے رکھی جائے۔ لیکن مضامین کی کثرت کو دیکھ کر صفحات کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا ہے اسکے باوجود ہم کئی اچھے مضامین روک دینے پر مجبور ہوئے۔ جو انشاءاللہ عام اشاعتوں میں شائع ہوتے رہیں گے ؎

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را　　من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اگر دو لفظوں میں سمیٹا جائے تو اسے محور انسانیت کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے دنیا آج کی ہو یا ہزاروں سال بعد کی وہ جب بھی حقیقی انسانیت کی تلاش کریگی تو مجبور ہو کر اسے حضور اکرم ہی کی طرف جھکنا پڑیگا۔ اور جتنا جتنا وہ اس پاک ہستی کی طرف جھکتی جائیگی اتنا اتنا ہی اس کی زندگی میں نکھار اور حسن پیدا ہوتا چلا جائیگا ——— اور اگر اس پاک زندگی کو پھیلایا جائے تو دنیا کتنا ہی کچھ بیان کرتی چلی جائے موضوعات اور انکے تنوعات کم ہونے میں نہیں آئیں گے۔ جس طرح تاریکی میں ہر انسان روشنی کا محتاج ہے اسی طرح ہر دور اور اس دور کا ہر انسان اس پاک ہستی کا ہر وقت محتاج رہے گا۔ اس دین کا جسے قیامت تک کارفرما رہنا ہے یہی تقاضا بھی ہونا چاہئے کہ اس کو پیش کرنے والی ہستی کی تعلیمات ہر زمانے میں روشن اور تابندہ رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ دعوت نے ابتک جتنے خصوصی نمبرات پیش کئے ہیں انہیں شرف قبولیت عطا ہوا ہے۔ آئندہ کیلئے ہمارا ارادہ ہے کہ "ہندوستان میں دینی جد و جہد" اور "مسلم ہندوستان" کے موضوعات پر دو نمبر نکالے جائیں۔ اول الذکر نمبر میں آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک کی تمام کوششوں کا تعارف کرایا جائے نیز یہ کہ ان کوششوں سے یہاں کا سماج کتنا متاثر ہوا۔ دوسرے نمبر میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ضلع یا ریاست وار جائزہ لیا جائے جو رجحانات ان میں پائے جاتے ہیں جو گمراہیاں ان میں گھس آئی ہیں جن اثرات کے وہ حامل ہیں، جو جو اثاثے ان کے پاس موجود ہیں وغیرہ امور کو پیش کیا جائے ——— دعا کیجئے کہ خدا ان نمبرات کو مرتب کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

دینِ اسلام کی تبلیغ کا دلنشین ذریعہ

پیغمبری دعائیں ارشاد ہے "الدعاء سلاح المومن" دعا مومن کیلئے ڈھال اور تلوار ہے۔ اللہ کا محبوب بندہ نبی ورسول جب اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے تو اسی راز و نیاز کی عظمت تک پہونچنے سے پہلے جبرئیل کے پر جل جاتے ہیں یہ مقدس سرگوشیاں وہ مناجاتیں اور یہ محب و محبوب میں انداز گفتگو پیغمبری دعائیں ہیں۔
پیغمبری دعائیں اگر آپ پڑھ لیں تو خدا کو پکارنے میں صحیح لذت محسوس کرنے لگیں گے۔ یہ مستند دعاؤں کا بہترین مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ

رسول خدا کے اخلاق پیغمبر اسلام کا ایسی قوم میں ظہور ہوا جو نہایت سنگدل اور اخلاق سے کوری تھی معمولی معمولی باتوں پر قبیلوں میں صدیوں تک جنگ رہتی لیکن جب رسول اللہ نے اعلان توحید کیا تو یہ ان کی سب سے بڑی دولت "بت پرستی" پر ضرب تھی۔ یہ یہ تلخ گھونٹ انہوں نے کیسے اتارا اور ۲۳ سال کی زندگی میں رسول اللہ نے کس طرح ڈیڑھ لاکھ نفوس کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا؟ اس کا جواب رسول خدا کے اخلاق میں ملے گا۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے

دربار رسالت کے فرمان حضور سرور کائنات فخر موجودات کے وہ فرمان جو انہوں نے اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً اسلام اور انسانیت کے بلند مراتب کو سمجھانے کیلئے لوگوں سے فرمائے۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے

اسلام کا تبلیغی نظام مسلمانوں کے وجود کا مقصد ہی اچھائیوں کی اشاعت اور برائیوں کی ممانعت خداوند تعالیٰ نے رکھا تھا۔ اسی مقصد کے لئے وہ پیدا ہوئے ہیں مذہبی انتظام میں سب سے زیادہ ضروری اور مقدم کام تبلیغ اسلام اور توحید کی اشاعت ہے۔ حضور رسول اکرم کی تشریف آوری بھی ان ہی مقاصد کے پیش نظر تھی شروع شروع میں حضور انفرادی طور پر گھر گھر جاکر تبلیغ فرماتے تھے اس کے بعد اجتماعی تبلیغ اور دوسرے ذرائع اختیار فرمائے کتاب اسلام کا تبلیغی نظام آپ کی دین اور دنیا سنوارنے والی کتاب ہے۔ قیمت ۸۲ نئے پیسے

شہید کربلا ؂ اے کربلا کی خاک تو اس احسان کو نہ بھول پیاسا کر گیا تجھے خون رگ رسول
شہادت امام حسین کا بیان اور مولانا آزاد کی زبان، اندازہ کیجئے کہ کتاب کس معیار کی ہوگی۔ قیمت ایکروپیہ ۵۰ نئے پیسے

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

معارف السنۃ جن تعلیمات نے خاک نشین بدوؤں کو تختِ جہانبانی پر بٹھایا اور جن کی تجلیات سے آتش کدۂ فارس گل ہو گیا وہ تعلیمات آج بھی حرف بحرف ہمارے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہیں اگر ہم ان کو آج بھی سمجھ کر اپنے لئے آئینِ حیات بنالیں تو خدا کی رحمتیں اپنی گود میں لے لیں۔ اس کتاب میں رسول اکرم کی مشہور اور زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والی احادیث کو جمع کر کے ایسے دلنشین اور عام فہم اور پُر مغز انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ آج تک اردو کا دامن اس دولت بے بہا سے خالی تھا۔ احادیث کے ترجمہ اور تشریح کے بعد ہر حدیث کے اجمالی اقتباسات کو تاریخ و سیر کی مستند کتابوں سے مفصل بیان کر کے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان فرامین رسول سے مسائل و معارف کی کتنی کرنیں پھوٹتی ہیں اور مومن کی زندگی کے کن کن گوشوں کو منور کرتی ہیں۔ قیمت ۴ روپے

تاج بہشتی زیور مکمل و مدلل محشی (حکیم الامت حضرت مولینا اشرف علی صاحب تھانوی) اسلامی معلومات کا دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بغیر کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ چونکہ ایک مسلمان کے پیدا ہونے سے مرنے تک کے تمام ضروری مسائل شرعیہ نہایت تفصیل سے اور تحقیق کے ساتھ ایک جگہ صرف اس عظیم الشان کتاب ہی میں مل سکتے ہیں۔ تقریباً بارہ سو صفحات گلیز چکنا کاغذ قیمت مجلد ۱۵ روپے، غیر مجلد ۱۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

معجزات النبی صلعم دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے اور سب کو خصوصیات سے خدا نے نوازا، رسول آخر الزماں فخرِ موجودات النبی الہاشمی العربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلۂ زریں ختم ہو گیا۔ اس لئے ضروری تھا کہ سارے خصائص معجزات آپ پر تمام کر دئیے جائیں اس کتاب میں آپ کے سارے معجزات کا تحقیقی بیان نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کنکریوں کی گواہی، درختوں کا چلنا، چوپایوں کا سجدہ، جنات کی شہادت رسالت، نجوم و قمر میں انقلاب، کھانے اور پانی میں عجیب و غریب بادتی، بیماروں اور دائمی اپاہجوں پر دست رسالت پھیرنے سے صحت و شفا کے مناظر، شمول کے نرغے سے محفوظ طور پر نکلنا، قتل کی نیت سے آنا اور کلمہ پڑھ کر واپس جانا وغیرہ وغیرہ اسی طرح کے محیر العقول سینکڑوں معجزات کا بیان وہ معجزات جن سے رسالت کی صداقت پر دلیل و برہان قائم ہوتی ہے تمام معجزات حدیث و سیر کی معتبر کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ قیمت ۵، نئے پیسے

شرعی نماز غور تو کیجئے اسلامی شرعی نماز کیا ہے پانچوں وقت کی روزمرہ کی نماز اور رکعتوں اور دعاؤں کی تفصیل

نماز تہجد، نماز جنازہ، نماز تراویح، نماز عیدین، نفل نمازیں، محققانہ دلائل اور تفصیل کے ساتھ عبادت خداوندی کے اس ذریعہ پر اس سے بہتر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی آج ہی منگا لیجئے۔ مجلد سفید کاغذ قیمت صرف ایک روپیہ

اسلامی تاریخی کہانیاں (مولینا عبدالمومن صاحب فاروقی) اس کتاب میں تاریخ اسلام کی ایسی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں جمع کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر آپ پر اسلام کی حقانیت روز روشن کی طرح سامنے آجائیگی ان کہانیوں کو پڑھ کر آپ پر اسلام کی کم ہمتی دور ہوگی اور آپ سلف صالحین کے وہ کارنامے پڑھیں گے جن پر عمل کرنے کی تبلیغ وتلقین کی جائے تو مسلمانوں کی پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی ہو سکتی ہے زبان سلیس انداز بیان شگفتہ اور پھر اسلام کی حقانیت کا درس۔ طباعت وکتابت عمدہ مجلد بزرق سے مزین۔ قیمت دو روپے

قرآن اور عورت قرآن مجید نے عورتوں کو قعر مذلت سے نکال کر کس طرح بام عروج پر پہونچایا کن کن فرائض کی ادائیگی کے لئے اس کو تنبیہ کی، اسلام نے عورت ذات پر کیا کیا احکام صادر کئے اس پر ایک مکمل کتاب۔ قیمت ۱۲/

خدا کا انعام انسانی تمدن نے از زمین تا آسمان اپنی بساط عشرت بچھائی اور سرور وکیف میں جب انتہا کو پہونچا تو اس کی خود پسندی نے اپنے درمیان سے خدا کو حذف کرنے کی ناپاک سعی کی خدا کی قدرت مسکراتی رہی۔ خود پرستی میں اسی انسان کو جب ٹھوکر لگی تو قدرت نے دوڑ کر سہارا دیا۔ بندے کو جب ہوش آیا تو کہنا پڑا کہ دنیا میں جو کچھ ہے خدائی انعام ہے اس انعام کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اگر برگ وبار اور ذرات عالم کو وسیع دامن نصیب ہو تے تب بھی انعامات خداوندی کی نعمتوں کو نہیں سمیٹ سکتے۔ اس کتاب کی حقیقت، جاذبیت اور اس کا حیرت انگیز اثر اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

اعمال قرآنی قرآنی اعمال ووظائف کا بہترین مجموعہ جس کو حکیم الامت حضرت مولنا اشرف علی صاحب تھانوی نے مرتب کیا ہے اور اعمال ووظائف کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان کی خاصیتیں بھی بتائی گئی ہیں یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آج ہر گھر میں ضرورت ہے۔ نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ

اسکے علاوہ مترجم کلام مجید قاعدے، سیپارے، انجمن حمایت اسلام اور جمعیۃ علماء ہند کا تعلیمی نصاب ہمارے پتے سے طلب فرمائیں

فہرست کتب مفت طلب کریں

مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

طلوع سحر

استاذ علی احمد باکثیر

[آمنہ بنت وہب کا گھر ــــ آمنہ اور ان کی لونڈی برکہ (ام ایمن)]

برکہ :- نہیں بی بی نہیں۔ آج میں آپ کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔

آمنہ :- برکہ! میں چنگی بھلی ہوں، اور تمہارا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا سکتی ہوں۔

برکہ :- نہیں، نہیں، میں خود کام کر لوں گی۔ آپ آرام کیجئے۔ آپ کا نواں مہینہ جارہا ہے۔

آمنہ :- لیکن میں کسی قسم کا بار اور تکلیف محسوس نہیں کر رہی۔ بلکہ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ طبیعت زیادہ کھلتی جاتی ہے۔

برکہ :- بی بی آپ کا معاملہ مجھے تو بڑا عجیب نظر آتا ہے کیا آپ نے غیبی آوازیں نہیں سنیں؟

آمنہ :- ہر رات کو سنتی ہوں برکہ ـــ!

برکہ :- کل رات بھلا آپ نے کیا سنا تھا؟۔

آمنہ :- میں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا۔ اے آمنہ بنت وہب اتم اپنی آغوش رحم میں امتوں کے سردار کو اٹھائے ہوئے ہو جب وہ پیدا ہوں تو کہنا ''میں ہر حاسد کے شر سے اس بچے کو اللہ کی پناہ میں دیتی ہوں''!

برکہ :- کیا خیال ہے میں قتیلہ بنت نوفل کو نہ بلالاؤں وہ کچھ بتا سکے گی۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے علم میں اسے بھی کچھ درک حاصل ہے۔

آمنہ :- نہیں مجھے نہ اس معاملہ کی ٹوہ لگانے کی ضرورت ہے اور نہ قتیلہ کے بھائی کے علم کی حاجت۔

برکہ :- بی بی! قتیلہ تو آپ سے بڑی دلچسپی رکھتی ہے اور آپ جانتی ہیں کہ اکثر آپ کی خیر خیریت مجھ سے پوچھتی رہتی ہے۔ پھر اسے بلالانے میں کیا حرج ہے؟

آمنہ :- برکہ تمہیں خبر نہیں۔ قتیلہ عبداللہ کی صاحبہ ہے اور اس حمل کے بارے میں مجھ سے لاگ رکھتی ہے اسکا خیال ہے کہ یہ اس کا حق تھا۔ اور میں نے اس سے چھین لیا تم اس کا وہ شعر بھول گئیں، جو اس نے میرے

متعلق کہا ہے ۔ للہ مازھبتہ سنبت ثوبی ما سلبت ولا تلدہ ی ۔

برکہ : ۔ لیکن اب وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہے اور کوئی لاگ نہیں رکھتی ۔ آپ کی خیر خیریت محبت واخلاص ہی کی وجہ سے پوچھتی ہے ۔

آمنہ : ۔ (ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) پہلے اس کا یہ حال نہ تھا اب عبداللہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں اور ایسی جگہ چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا ۔ شاید اب اس کا رویہ بدل گیا ہو ۔

برکہ : ۔ آہ میرے آقا عبداللہ ! وہ جو قربانی کی آزمائش میں پورے اترے ہی تھے کہ جوانا مرگی نے آلیا اور کوئی مسرت نہ دیکھ سکے ۔

آمنہ : ۔ اے کاش وہ زندہ ہوتے اور اپنے بچے کو ایک نظر ہی دیکھ لیتے ۔ برکہ ! اگر یہ غیبی آواز مجھے مژدۂ جانفزا نہ سنایا کرتی اور اگر مجھے عبداللہ کی خاطر زندہ رہنے کی حرص نہ ہوتی تو میں اب تک غم کے مارے ہلاک ہو چکی ہوتی ۔

برکہ : ۔ بیشک بی بی آپ کی بپتا بڑی ہی المناک ہے ۔

آمنہ : ۔ مگر قریش کی عورتیں میرے صبر اور برداشت کو دیکھ کر مجھے ملامت کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ میں بڑی مطمئن ہوں ۔ کہتی ہیں کہ عبداللہ جیسا جوان رعنا ارض بطحا نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ ہم میں سے کوئی ہوتی تو ایک دن بھی نہ جیتی ۔ اللہ ان سے سمجھے ۔ انھیں کیا خبر کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور انھیں کیا علم کہ ہر رات غیبی آواز مجھے کیا بشارت دیتی ہے اگر انھیں ذرا بھی پتہ چل جائے تو کہنے لگیں کہ اس نے جھوٹ گھڑ لیا ہے ۔ یا کہ اسے آسیب ہے ۔

برکہ : ۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) بی بی ! قتیلہ آرہی ہیں ۔

آمنہ : ۔ قتیلہ ۔۔۔ !

برکہ : ۔ جی ہاں ۔۔۔ !

آمنہ : ۔ خوش آمدید ۔۔۔ برکہ انھیں خوش آمدید کہو ۔

قتیلہ : ۔ (داخل ہوتی ہے) آمنہ صبح بخیر ۔

آمنہ : ۔ خوش آمدید قتیلہ ! بڑی مدت کے بعد آئیں ۔

قتیلہ :- آج فرصت ملی تو سوچا تمہیں اور تمہارے نیک بخت لڑکے کو دیکھ آؤں۔

آمنہ :- قتیلہ ابھی تو معاملہ پردۂ غیب میں ہے۔

قتیلہ :- آمنہ! بس آج ہی ہو جائے گا۔ بھائی ورقہ ذکر کر رہے تھے کہ وہ سرخ ستارہ طلوع ہو گیا ہے جو اس نبی منتظر کی ولادت کی رات کو ظاہر کرتا ہے۔

آمنہ :- کیا یہ بات ورقہ نے تم سے کہی تھی؟

قتیلہ :- ہاں بخدا، میں تو سمجھی تھی کہ بچہ پیدا ہو چکا ہوگا۔

برکہ :- لیکن بی بی کیا خبر بچہ آج پیدا ہو یا کل پرسوں۔

قتیلہ :- اگر یہ بچہ وہی ہے تو لامحالہ آج ہی پیدا ہوگا۔ ہاں اس بچہ کو اگر کسی اور گھر میں پیدا ہونا ہے تو الگ بات ہے۔

برکہ :- نہیں ہرگز نہیں وہ نور سعادت اسی گھر میں طلوع ہوگا۔ غیبی آوازیں ہر رات ہماری بی بی کو بشارتیں دیا کرتی ہیں۔

آمنہ :- ٹھہرو برکہ!

قتیلہ :- غیبی آوازیں؟ آمنہ مجھ سے چھپاتی ہو؟ یا بہن یہ سمجھتی ہو کہ میں اب تک تم سے ناراض ہوں کہ تم نے مجھ سے اس شرف کو چھین لیا۔ رب کعبہ کی قسم نہیں۔ اللہ نے تمہیں اس شرف کے لئے چھانٹ لیا اور اس کی مرضی پوری ہو گئی، تم اس شرف کی مجھ سے زیادہ اہل بھی تھیں۔ تم عبداللہ کی بیوی تھیں۔ وہ تمہارے شوہر تھے۔ میں ایک بیگانی عورت تھی۔ اور میں نے تم سے اس شرف کو چھیننا چاہا تھا جو اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھا تھا۔ مجھے بتاؤ غیبی آوازیں تم سے کیا کہا کرتی ہیں؟

آمنہ :- قتیلہ! پکارنے والا تو ایک ہی ہے البتہ باتیں بہت سی ہیں جن میں سے بعض یاد ہیں اور بعض ذہن سے اتر گئی ہیں۔

برکہ :- بی بی۔ کل رات جو غیبی آواز آئی تھی وہ انھیں بتائیے۔

آمنہ :- کہنے والے نے کہا تھا۔ اے آمنہ تم نے امتوں کے سردار کو اٹھا رکھا ہے جب یہ پیدا ہوں تو یہ کہنا میں اس بچے کو ہر حاسد کے شر سے ذات واحد کی پناہ میں دیتی ہوں۔

قتیلہ :- آمنہ! تمہیں بشارت ہو۔ لاریب، یہ وہی نبی منتظر ہیں۔ بخدا میری آنکھ نے دھوکا نہیں کھایا تھا اس

روز میں نے عبداللہ کی جبین پر چمکتے ہوئے ستارے کی سی روشن سپیدی دیکھی تھی ۔لیکن جب وہ تمہارے پاس سے ہوکر لوٹے تو غائب تھی یہ بچہ وہی ہیں اور لامحالا آج ہی ان کی ولادت ہوگی ۔

آمنہ :- (تکلیف محسوس کرتے ہوئے) آہ !

برکہ :- بی بی کیا بات ہے ۔ تکلیف تو نہیں ؟

آمنہ :- برکہ ! میری پیٹھ میں درد رینگتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

قتیلہ :- برکہ دوڑ کر قابلہ کو بلا لاؤ ۔ مجھے یہ کام اچھی طرح نہیں آتا ۔ کاش میں جانتی ہوتی ۔

برکہ :- اور بہن مجھے بھی نہیں آتا ۔

قتیلہ :- جھٹ پٹ جاؤ ۔ شفا کو لے آؤ ۔ وہی مکہ کی سب سے تجربہ کار دائی ہے اس کا گھر جانتی ہو نا ؟

برکہ :- جی ہاں جانتی ہوں ۔ آپ میرے آنے تک یہیں ٹھہریئے گا ۔

قتیلہ :- میں جب تک اس بابرکت بچے کا دیدار نہ کر لوں گی ۔ یہاں سے نہیں جاؤں گی ۔

(برکہ چلی جاتی ہے)

آمنہ :- قتیلہ ۔۔۔ !

قتیلہ :- آمنہ ہاں کہو کیا ہے ؟

آمنہ :- اللہ تجھے جزائے خیر دے ۔ کہ تم مجھ سے راضی ہوگئیں اور اس واقعہ کو بھلا دیا ۔

قتیلہ :- اے بنت وہب ! خدا نے یہ برکت و سعادت تیرے مقدر میں لکھ رکھی تھی ۔ میں اگر ماں نہیں بن سکی تو پہلی عورت تو ہوں گی جو اس کا دیدار کروں گی ۔

(۲) (خانۂ کعبہ میں حجر اسود کے قریب عبدالمطلب تنہا بیٹھے ہیں ۔ مغیرہ المخزومی اور وائل السہمی داخل ہوتے ہیں ۔)

مغیرہ :- وہ عبدالمطلب تنہا بیٹھے ہیں آؤ ان کے پاس چل کر بیٹھیں ۔

وائل :- ان کے پاس بیٹھ کر کیا کریں گے وہ تو ہر وقت عبداللہ کے غم میں غلطاں رہتے ہیں جیسے دنیا جہان سے اگلے انہی کا بیٹا مرا ہے ۔

مغیرہ :- سچ کہتے ہو چلو ان سے دور بیٹھ کر اپنی باتیں کریں دیکھو ان کا بیٹا ابوطالب ان کی طرف جا رہا ہے ۔

وائل۔ چھوڑو! اپنے بوڑھے باپ کی دلجمعی کرنے چلا ہوگا (دونوں دور چلے جاتے ہیں)

ابوطالب:۔ ابا جان! صبح بخیر۔ آپ یہاں تنہا بیٹھے ہیں؟

عبدالمطلب:۔ ہاں بیٹے!

ابوطالب:۔ اور آپ کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں؟

عبدالمطلب:۔ افسوس ہے تم پر۔ مجھے کسی قریشی نے دیکھا تو نہیں؟

ابوطالب:۔ نہیں ابا جان۔ وہ تو آپ سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ آپ کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھ کر لاپروائی سے گزر جاتے ہیں۔

عبدالمطلب:۔ بیٹے میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے آہ وزاری کرتے دیکھیں۔ وہ مجھے عبداللہ کے بارے میں ملامت کرتے ہیں۔ اے عبدالعزیٰ ان لوگوں کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہیں۔

ابوطالب:۔ ابا جان! وہ اپنی ملامت میں حق بجانب بھی تو ہیں۔

عبدالمطلب:۔ ہائے افسوس! عبدالعزیٰ، میں تو تمہیں ان کی طرح سنگدل نہیں سمجھتا تھا۔

ابوطالب:۔ نہیں میں سنگدل نہیں ہوں۔ عبداللہ میرے بھائی تھے۔ میرے قوت بازو تھے۔ مگر تقدیر کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وہ فوت ہو گئے اور اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ان کی وفات کو سال ہونے کو آیا ہے اب حزن وملال سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

عبدالمطلب:۔ افسوس اے بیٹے۔ میرا یہ حزن وملال ہر روز اس کی یاد میرے دل میں تازہ کر دیتا ہے۔

ابوطالب:۔ عبداللہ فوت ہو گئے تو آپ کے سب بیٹے تو زندہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آپ کا دست و بازو ہے وہ کون سی بات ہے جس کی توقع آپ کو عبداللہ سے تھی اور ہم سے نہیں ہے۔

عبدالمطلب:۔ آہ اے عبدالعزیٰ! بخدا میرا یہ حزن وملال اس لئے نہیں کہ عبداللہ میرا مددگار تھا اور تم لوگ نہیں ہو۔ وہ نہ تم سے زیادہ طاقتور تھا اور نہ تم سے بڑھ کر کام کاج کرتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک وہ ایک ایسی شان کا حامل تھا جو اس زندگی سے جس میں ہم صبح وشام کرتے ہیں بالکل نرالی اور جدا تھی۔

ابوطالب:۔ ابا جان اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

عبدالمطلب:۔ عبدالعزیٰ! جن باتوں کا تمہاری آنکھ خود مشاہدہ کر چکی ہے ان کی میں تشریح کیا کروں۔ تم خود ان کی تہہ تک پہونچ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ عبداللہ کے عوض کس طرح سو اونٹ قربان کئے گئے۔

ابوطالب:۔ بے شک۔

عبدالمطلب:۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آمنہ بنت وہب سے اس کی شادی کیسے ہوئی اور وہ اس کے ساتھ صرف تھوڑی مدت رہ سکا۔؟

ابوطالب:۔ جی ہاں۔

عبدالمطلب:۔ اور کیسے سفر پر روانہ ہوا۔ اور پھر لوٹ کر نہیں آیا؟

ابوطالب:۔ بے شک۔

عبدالمطلب:۔ اس نشانی کو تو جانے دو جس کا مشاہدہ ابھی دو مہینے پہلے ہم نے کیا ہے۔ اللہ نے ہمیں اصحابِ فیل سے کس طرح بچایا۔ اور اسے اور اس کے لشکر کو ابابیل کے ہاتھوں ہلاک کر دیا۔ یہ عبداللہ کی زندگی کا فدیہ، شادی کے بعد جلد ہی اس کا مرنے کیلئے سفر پر روانہ ہو جانا، یہ سب باتیں اپنے اندر اہمیت رکھتی ہیں۔

ابوطالب:۔ ابا جان آپ سچ کہتے ہیں۔ ان سب باتوں سے عبداللہ کی شان ہویدا ہوتی ہے اور آپ کا حزن و ملال بجا ہے شاید کہ آمنہ کے ہاں لڑکا پیدا ہو جو اپنے باپ سے زیادہ آپ کو محبوب اور افضل ہو۔

عبدالمطلب:۔ عبدالعزیٰ! اگر آمنہ کے لڑکا پیدا ہوا تو میں اس کا نام محمد رکھوں گا۔ محمد بن عبداللہ ابن عبدالمطلب۔

ابوطالب:۔ ابا جان! دیکھئے برکہ آرہی ہے۔ آمنہ کی لونڈی۔

عبدالمطلب:۔ برکہ! آؤ برکہ! پیچھے کیا چھوڑ کر آئی ہو۔؟

برکہ:۔ آقا مژدہ ہو — میری بی بی آمنہ کے لڑکا ہوا ہے۔

عبدالمطلب:۔ اے اللہ حمد و ثنا تیرے ہی لئے ہے۔

۳۔ (آمنہ کے گھر میں)

ام العاص:۔ شفاء! دیکھو اس کی طرف دیکھو۔

شفار:۔ ام العاص۔ ہاں دیکھا ہے خوب من موہنا بچہ ہے۔

ام العاص:۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ دیکھے جاؤں۔ ایسا حسین و جمیل بچہ تو میری آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔

قتیلہ:۔ (آہستہ سے) یہ وہی ہیں۔ یہ وہی ہیں۔

شفار:۔ ام العاص! ذرا ادھر ہونا۔

ام العاص:۔ دیکھو تو پپوٹے کیسے سیاہ ہیں جیسے سرمہ ڈالا ہوا ہے۔ اور پھر دیکھو شفار! بچہ مختون بھی ہے۔

قتیلہ:۔ یہ وہی ہیں ——— یہ وہی ہیں

ام العاص:۔ اور عجیب بات ہے اس کی نگاہیں آسمان میں گڑی ہوئی ہیں۔

قتیلہ:۔ یہ وہی ہیں۔

ام العاص:۔ قتیلہ! کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کون وہی ہیں؟

قتیلہ:۔ نبی منتظر۔

دونوں عورتیں:۔ (ہم آہنگ ہوکر) نبی منتظر۔

قتیلہ:۔ ہاں، کیا تم نے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی نور کو پھوٹتے نہیں دیکھا تھا؟

شفار:۔ ہاں، میری تو آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

ام العاص:۔ میں نے اس وقت آسمان پر نظر دوڑائی تھی میں نے دیکھا کہ شرق و مغرب منور ہو گئے ہیں۔

شفار:۔ آمنہ! تم کیوں چپ ہو۔ قتیلہ کی بات تم نے سنی۔

آمنہ:۔ ہاں سنی ہے۔

شفار:۔ تمہارا کیا حال ہے؟ کیا درد ہے؟

آمنہ:۔ بالکل نہیں ——— برکہ کہاں ہے؟

شفار:۔ وہ اس کے باپ کو مژدہ سنانے گئی ہے۔

آمنہ:۔ باپ کو ——— (افسردہ ہو جاتی ہے)

شفار:۔ ہاں ——— اس کے باپ عبدالمطلب کو۔

آمنہ :۔ ٹھیک ہے، عبدالمطلب اس کے باپ ہیں۔ اور کیا ہی خوب بزرگ باپ ہیں۔

ام العاص :۔ وہ دیکھو ——— وہ آرہے ہیں۔

عبدالمطلب :۔ (داخل ہوتے ہیں) بیٹی آمنہ! کیا حال ہے؟

آمنہ :۔ اباجان ——— ! بخیر ہوں۔

عبدالمطلب :۔ (پُرمسرت آواز میں) میرا بیٹا! یہ میرا بیٹا ہے میں اس کا نام محمد رکھتا ہوں۔

آمنہ :۔ محمد؟

عبدالمطلب :۔ ہاں آمنہ! محمد۔

آمنہ :۔ لیکن مجھے تو کہا گیا ہے کہ اس کا نام احمد رکھوں۔

عبدالمطلب :۔ کیا ہاتف نے تمہیں کہا ہے؟

آمنہ :۔ جی ہاں۔ اباجان!۔

عبدالمطلب :۔ احمد اور محمد دونوں ہی نام سہی۔ احمد اللہ کے نزدیک اور محمد لوگوں کی نظر میں، شفا! میں ذرا اسے اٹھالوں۔

شفار :۔ جی ہاں اٹھا لیجئے۔

عبدالمطلب :۔ (اٹھا لیتے ہیں) دیکھو بیٹی آمنہ! کیسی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور مجھ سے چمٹا جاتا ہے۔ میں اسے خانۂ کعبہ میں لئے جاتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کے وجود کو مبارک بنائے۔

شفار :۔ اے عبدالمطلب! ذرا نرمی سے لے جائیے گا۔

عبدالمطلب :۔ واہ شفار واہ! یہ میرا جگر گوشہ ہے۔ مجھے دل و جان سے پیارا ہے اور بڑی عظمت و شان والا ہے۔ بیٹی آمنہ! میں ابھی واپس آجاؤں گا۔ (چلے جاتے ہیں)

قتیلہ :۔ عجیب بات ہے۔ عبدالمطلب کو بھی اس معاملہ کی خبر ہے۔ میں جاتی ہوں اور اپنے بھائی ورقہ کو بشارت سناتی ہوں۔

(۴)

(کعبہ میں حجرِ اسود کے نزدیک، ورقہ بن نوفل عبدالمطلب کے پیچھے چلا آرہا ہے)

ورقہ :۔ اے ابوالحارث ذرا رکو تو۔

عبدالمطلب :۔ کون ؟ (متوجہ ہوتے ہیں) ورقہ بن نوفل، آؤ ورقہ مجھے مبارکباد دو۔

ورقہ :۔ (قریب آجاتا ہے) تجھ اکیلے کو مبارکباد دوں ؟ میں ساری دنیا کو مبارکباد دیتا ہوں۔

عبدالمطلب : کس بات کی، اے ورقہ۔

ورقہ :۔ اس لڑکے کی جس کو تم نے اٹھا رکھا ہے۔

عبدالمطلب :۔ ورقہ یہ میرا بیٹا ہے، عبداللہ کا بیٹا ہے۔ آمنہ بنت وہب کا بیٹا ہے۔

ورقہ :۔ ہاں، ابوالحارث، ذرا دکھاؤ تو۔ میں بھی دیکھوں۔

عبدالمطلب :۔ لو دیکھو، کیا ہی جمیل، کیا ہی حسین اور کیا ہی خاموش بچہ ہے۔

ورقہ :۔ بیشک، اے ابوالحارث تمہارا یہ بیٹا بڑی ہی عظمت وشان والا ہوگا۔ اسے لے کر کہاں جا رہے ہو۔

عبدالمطلب :۔ کعبہ کے اندرونی حصہ میں۔ عبدالعزیٰ ذرا پہلے جاکر دروازہ کھولو۔

ابوطالب :۔ بہت اچھا ابا جان (باب کعبہ کی طرف چلے جاتے ہیں)

ورقہ :۔ ابوالحارث ! ایسا نہ کرو۔

عبدالمطلب :۔ ابن نوفل ! تم پر افسوس ہے کیا تم میرے بیٹے کو کعبہ سے نکال دینا چاہتے ہو ؟

ورقہ :۔ نہیں عبدالمطلب نہیں۔ بلکہ کعبہ کے اندر جو بت رکھے ہیں ان سے تیرے جگر گوشہ کو دور رکھنا چاہتا ہوں۔

عبدالمطلب :۔ اے بھائی ! اپنے باپ دادا کے دین سے پھر جانے والے تو اپنی باتیں رہنے دے بخدا میں اسے لیکر کعبہ کے اندر ضرور داخل ہوں گا۔ اور اس کے لئے اللہ سے دعا کروں گا۔

ورقہ :۔ ابوالحارث ! دعا کرنی ہے تو یہیں باہر کرلو۔

عبدالمطلب :۔ نہیں بخدا میں کعبہ کے اندر ہی لے جاکر اللہ سے دعا کروں گا۔ کیوں عبدالعزیٰ کیا بات ہے ۔ ؟ واپس چلے آئے ہو ؟ کیا معاملہ ہے ؟

ابوطالب :۔ ابا جان ! میری آنکھوں نے ایک دہشتناک نظارہ کیا ہے

عبدالمطلب :۔ کیا ہوا ۔ ؟

ابوطالب :۔ معبود ـــــــ اباجان معبود۔

عبدالمطلب :۔ کیوں ان پر کیا بیتی ہے ـــــــ ؟

ابوطالب :۔ وہ سارے کے سارے زمین پر اوندھے منہ گرے پڑے ہیں۔

عبدالمطلب :۔ ہبل بھی۔

ابوطالب :۔ جی ، ہبل بھی۔

عبدالمطلب :۔ ایسی عجیب بات میں نے آج تک نہ سُنی تھی۔

ورقہ :۔ عبدالمطلب تعجب نہ کرو۔ یہ بچہ جسے تم نے اٹھا رکھا ہے۔ ان سب کا دشمن ہے۔

عبدالمطلب :۔ نوفل کے بیٹے۔ اپنے ان قصے کہانیوں سے مجھے معاف رکھو۔ (ابوطالب سے) بیٹے ہمارے داخل ہونے سے پہلے جاؤ انھیں جا کر سیدھا کر دو۔ یا صرف ہبل ہی کو۔

ابوطالب :۔ اباجان ! میں ابھی جا کر سیدھا کئے دیتا ہوں۔

ورقہ :۔ اے ابن ہاشم ! میری نصیحت کو سنو۔ جس جگہ بت رکھے ہوں وہاں تمہیں اس لڑکے کو لیکر نہیں جانا چاہئے۔

عبدالمطلب :۔ تم اپنی اس نصیحت کو رہنے دو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

ابوطالب :۔ (کعبہ کے دروازے پر ظاہر ہوتے ہیں) اباجان میں نے ہبل کو سیدھا کر دیا ہے۔

عبدالمطلب :۔ بیٹے اچھا کیا (دروازے کے قریب پہونچے ہیں) اے اللہ تیرے نام کے ساتھ میں اندر قدم رکھتا ہوں (اندر داخل ہو جاتے ہیں) ـــــــ (بچے کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ابوطالب :۔ (جو دروازہ پر کھڑے ہیں) اباجان منا بڑا مضطرب ہے اور چیخ رہا ہے۔

عبدالمطلب :۔ (آواز سنکر) بیٹے عجیب بات ہے۔ یہ ابھی تو چنگا بھلا تھا پھر اسے کیا ہو گیا کہ رونے لگا ہے۔

ابوطالب :۔ شاید معبود اسے پسند نہ کرتے ہوں اور اس کی برائی چاہتے ہوں۔

عبدالمطلب :۔ بیٹے ورقہ کی طرح نہ بنو۔ معبود اس کے سوا اور کسے پسند کرسکتے ہیں جو برکت والا ہے اور صاحب شان ہے۔

ابوطالب :۔ تو آپ ذرا اسے لیکر باہر آئیے اگر یہ چپ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ معبود ہی اس رونے کا سبب ہیں۔

عبدالمطلب :۔ بیٹے ! ٹھیک ہے (بچے کو لئے کعبہ سے باہر آتے ہیں) عجیب بات ہے یہ تو چپ ہو گیا ہے۔

ابوطالب :۔ اباجان دیکھئے۔ منا ہنس رہا ہے اور آنسو آنکھوں میں جھلملا رہے ہیں۔

ورقہ :۔ ابوالحارث میں نے تم سے نہیں کہا تھا ؟ ۹

عبدالمطلب :۔ افسوس ہے تم پر، کیا تم سمجھتے ہو کہ معبود اس کو اذیت پہونچا رہے ہیں۔ ؟

ورقہ :۔ نہیں وہ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ بلکہ یہ بچہ ان سے کراہت کرتا ہے اور ان کے سامنے ہونا ناپسند کرتا ہے عبدالمطلب اس گھر کے مالک کی قسم، یہ بچہ جب بڑا ہوگا تو یہ ایک روز ان اصنام کو توڑ پھوڑ کر رکھدے گا۔ اور ان کی پلیدی سے کعبہ کو پاک کر دے گا۔

عبدالمطلب :۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ کعبے کے اندر جا کر اللہ سے اس بچے کے لئے دعا مانگوں۔

ورقہ :۔ تو پہلے ان بتوں کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔

عبدالمطلب :۔ افسوس ہے تم پر اگر کوئی قریشی سن پائے تو وہ پوری بستی میں شور مچادے گا۔ کہ عبدالمطلب ورقہ بن نوفل کی طرح بے دین ہو گیا ہے۔

ورقہ :۔ تو پھر کعبہ سے باہر ہی دعا مانگ لو۔

عبدالمطلب :۔ ہاں میں ایسا ہی کروں گا۔ (تضرع وزاری کے ساتھ) الحمد للہ الذی اعطانی ھذا الغلام الطیب الاردان × اعیذہ بالبیت ذی الارکان × من شر کل حاسد وشانی (اللہ ہی ساری حمد وثنا کا سزاوار ہے۔ جس نے مجھے یہ لڑکا عطا کیا۔ جو نہایت ہی پاک دامن . . . . ہے میں اسے ہر حاسد دشمن کے شر سے اس گھر کی پناہ میں دیتا ہوں ،

ابوطالب :۔ اباجان، ذرا منے کو دیکھئے کیسے مسکرا رہا ہے جیسے چودھویں کا چاند مسکراتا نظر آتا ہے۔

عبدالمطلب :۔ ہاں کیا ہی حسین جمیل بچہ ہے۔ اے پیارے بیٹے ! میں تجھ پر جی جان سے فدا ہوں۔ چلو عبدالعزیٰ اب گھر چلیں۔ اس کی ماں منتظر ہو گی۔ اسے دودھ بھی پینا ہوگا۔ آؤ تم بھی آمنہ کو سلام کرو۔

ابوطالب :۔ اباجان آپ چلئے۔ میں آپ کے پیچھے آتا ہوں۔

عبدالمطلب :۔ کس لئے بیٹے ؟

ابوطالب :۔ ان معبودوں کو سیدھا کر کے ان کے مقامات پر نصب کر دینا چاہئے۔ مبادا انھیں اس حالت میں دیکھ کر

کوئی بدگمانی کرے۔

عبدالمطلب :۔ ہاں بیٹے! ٹھیک کہا۔ دیکھو عبدالعزیٰ اور اے نوفل کے بیٹے سنو۔ بہل اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ کوئی بھی شخص اسے سچ نہ ماننے گا اور یہی سمجھے گا کہ ہمیں نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا تھا۔

ورقہ :۔ ہاں عبدالمطلب اس بچے کی سلامتی کی خاطر اس راز کو چھپانا ضروری ہے۔

عبدالمطلب :۔ ابن نوفل۔ تمہیں جزائے خیر ملے۔

ورقہ :۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب قریش وہ بات دیکھ اور سن لیں گے جس کا دیکھنا اور سننا مشیت نے لکھ دیا ہے پس خوش نصیب ہے وہ شخص جو ان رسول امین پر ایمان لایا اور ہلاکت ہے اس کے لئے جس نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ اور ان کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کیا۔

عبدالمطلب :۔ کیا میرا یہ جگر گوشہ واقعی ایسی عظمت و شان کا حامل ہوگا ؟!

ورقہ :۔ ہاں یہ عظمت و شان ان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے۔ ان کی قوم انہیں اپنے شہر سے نکال دے گی مگر لامحالہ ان کی قوت بڑھتی اور ان کا دین پھیلتا جائے گا۔

عبدالمطلب :۔ ورقہ! کیا مکہ والے میرے جگر گوشہ کو نکال دیں گے ؟!

ورقہ :۔ ہاں عبدالمطلب! وقت مقررہ پر ایسا ہو کر رہے گا۔ اس وقت تک اگر میں زندہ رہا تو میں ان کی مدد کروں گا اور ان کا ساتھ دوں گا۔

عبدالمطلب :۔ اللہ تمہاری عمر میں برکت دے۔ واللہ تم نے بڑی خوشخبری دی ہے اور اس بات پر میری مسرت اور بڑھ گئی ہے کہ تم قریش کے مقابلہ میں میرے بچے کا ساتھ دوگے۔

ورقہ :۔ یہ اسمٰعیل کے بیٹے اور ابراہیم کی دعا کا حاصل ہیں اور ابراہیم و اسمٰعیل کا پروردگار ان کی حفاظت و نگہداشت کرے گا ——————— عبدالمطلب :۔ اور قریش کا کیا بنے گا ورقہ ؟

ورقہ :۔ قریش کی فکر چھوڑو۔ اے عبدالمطلب! وہ روز عنقریب آرہا ہے جب قریش کی موجودہ ہیبت جاتی رہے گی اور اس کا ذکر بجز اس کے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ کہ وہ اس بچے کا قبیلہ تھا (المسلمون)

حضور اکرم کی شبیہ مبارک

نعیم صدیقی

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہئ قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا روئے زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالم واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضور کے حسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک پا سکتے ہیں وہ حضور کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پا سکتے ہیں۔

حضور کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے خود ہی حضور نے امت کو اس سے باز رکھا، کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے دور سے دور نہ رکھ سکتا۔ حضور کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے۔ اور اس کے اعزاز کے لئے کیسی کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں۔ بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضور کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کونسا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضور کے عالم خیال اور کردار کا گوشہ بہ گوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو۔ اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسم مبارک محمد تھا۔ بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضور کا نام دے دیا جاتا ہے معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا۔ بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لئے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور چرچوں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کے مظہر ہیں انبیاء اور صلحاء کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے رہ جائیں۔

لیکن حضورؐ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں حضور کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحاب روایت نے ہم تک پہونچا دیا ہے یہاں ہم اسی لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضور کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے ——!

ایک تعارف ——!!

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

حضور کے چہرۂ اقدس، قد و قامت، خدوخال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہونچتا ہے وہ بہرحال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت، صبر و استقامت، امانت و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصاف حمیدہ کا جامع تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ حضور کے جسمانی نقشے میں روح نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے اور آپ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبے کی ایک دلیل تھی اس موقع پر آپ کا ارشاد یاد آیا۔ فرمایا وان تقوی اللہ تبیض الوجوہ خدا کا تقوےٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔ نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہئے۔

سو یہ ہے اس آفتاب حق کی ایک جھلک۔

وجاہت :۔۔۔

" میں نے جونہی حضور کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔[1] "

(عبداللہ بن سلام)

" میں اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں خدا کے رسول۔ دیکھتے ہی میں نے کہا: " واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں " (شمائل ترمذی) (ابورمثہ تیمی)

" مطمئن ہو میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا وہ کبھی ہمارے ساتھ بدمعاملگی کرنیوالا شخص نہیں ہو سکتا اگر ایسا آدمی (اونٹ کی) رقم ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی[2] " (ایک معزز خاتون)

---

[1] یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حصین تھا۔ سرور عالم کے مدینہ آنے پر یہ دیکھنے کو گئے، دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا بعد میں اسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔

(سیرۃ المصطفیٰ۔ مولانا ادریس کاندھلوی، جلد اول ص ۲۴۹، ۲۵۰)

[2] مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا۔ اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضور کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا۔ ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوائے دیتا ہوں۔ بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی کہ بغیر جان پہچان کے معاملہ کر لیا۔ اس پر سردار قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا جو خود شریک قافلہ تھے بعد میں حضور نے طے شدہ قیمت سے زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوا دیں۔

سہ روزہ دعوت کی خصوصی پیشکش

"ہم نے ایسا خوبرو شخص کوئی اور نہیں دیکھا" یہ خواتین حضور کی خدمت میں ابو قرصافہ کے ساتھ بیعت اسلام کے لئے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے انہوں نے اپنے تاثرات بیان کئے) "ہم نے اسکے منہ سے روشنی سی نکلتے دیکھی ہے۔"
(ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)

"حضورؐ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا گویا آفتاب چمک رہا ہے۔" (ابو ہریرہ)

"اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔" (ربیع بنت معوذ)

"دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا۔" (حضرت علی)

"میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور کو دیکھ رہا تھا آپ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپ کو۔ بالآخر میں اس فیصلے پر پہونچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔"
(حضرت جابر بن سمرہ)

"خوشی میں حضور کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے۔"
(کعب بن مالک)

"چہرے پر چاند کی سی چمک تھی۔" (ہند بن ابی ہالہ)

چہرہ

"بدر کی طرح گولائی لئے ہوئے۔" (براء بن عازب)

"چہرہ بالکل گول نہیں تھا۔ ہلکی گولائی لئے ہوئے۔" (حضرت علی)

"پیشانی کشادہ — ابرو خمدار — باریک اور گنجان — دونوں جدا جدا — دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہو جاتا۔" (ہند بن ابی ہالہ)

"مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی۔" (کعب بن مالک)

رنگت

"نہ چونے کی طرح سفیدی — نہ سانولہ پن — گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی۔"

(حضرت انس)

"سفید، سرخی مائل" (حضرت علی)

"سفید، مگر ملاحت دار" (ابوالطفیل)

"سفید۔ چمک دار" (ہند بن ابی ہالہ)

"گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا" (حضرت ابوہریرہ)

آنکھیں

"آنکھیں سیاہ۔ پلکیں دراز" (حضرت علی)

"پتلیاں سیاہ، نظریں نیچی، گوشۂ چشم سے دیکھنے کا حیادارانہ انداز" (ہند بن ابی ہالہ)

"سفیدی میں سرخ ڈورے، آنکھوں کا خانہ لمبا، قدرتی سرگیں" (جابر بن سمرہ)

ناک

"بلندی مائل، اس پر نورانی چمک، جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی"

(ہند بن ابی ہالہ)

رخسار

"ہموار اور ہلکے۔ نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا" (ہند بن ابی ہالہ)

دہن

"فراخ" (جابر بن سمرہ)

"با اعتدال سے فراخ" (ہند بن ابی ہالہ)

دندان مبارک

"باریک، آبدار، سامنے کے دانتوں میں خوشنما ریخیں" (حضرت ابن عباس)

"تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی معلوم ہوتی" (حضرت انس)

ریش

"بھرپور اور گنجان بال" (ہند بن ابی ہالہ)

گردن

• پتلی، لمبی — جیسے بھیگی کی طرح خوبصورتی سے تراشا گیا ہو۔

• گردن کی رنگت چاندی جیسی اجلی اور خوشنما۔ (ہند بن ابی ہالہ)

سر

• بڑا — مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ۔ (ہند بن ابی ہالہ)

بال

• قدرے خمدار۔ (حضرت ابو ہریرہ)

• نہ بالکل سیدھے تنے ہوئے — نہ زیادہ پیچدار۔ (قتادہ)

• ہلکا خم لئے ہوئے۔ (حضرت انس)

• گنجان — کبھی کانوں کی لو تک لمبے، کبھی شانوں تک۔ (براء بن عازب)

• درمیان سے نکلی ہوئی مانگ۔ (ہند بن ابی ہالہ)

• بدن پر بال زیادہ نہ تھے، سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر۔ (حضرت علی)

• کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصہ پر تھوڑے سے بال تھے۔ (ہند بن ابی ہالہ)

مجموعی ڈھانچہ

• بدن گٹھا ہوا، اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط۔ (ہند بن ابی ہالہ)

• بدن موٹا نہیں تھا۔ (حضرت علی)

• قامت مائل بہ درازی۔ مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا۔ (براء بن عازب)

• قد — نہ زیادہ لمبا تھا نہ پست — میانہ۔ (حضرت انس)

• توند بڑھی ہوئی نہ تھی۔ (ام معبد)

• دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضور کا جسم (باوجود فقر و فاقہ کے) زیادہ ترو تازہ اور توانا تھا۔ (ایک مرتبہ حضور نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھوں سے نحر کئے) (المواہب ج ۱ صلا ۲)

"میں نے رسول اللہ سے بڑھ کر کوئی اور بہادر اور زور آور نہیں دیکھا (ابن عمر) (مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضور کسی ملحقہ وادی میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی اس نے دعوت کے لئے کوئی معیار صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیش نظر حضور نے کشتی کرنا پسند کر لیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپ نے اسے پچھاڑ لیا اسی رکانہ پہلوان کے بیٹے ابو جعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں لی ہے اور ابو داؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے بیہقی نے سعید بن جبیر کی دوسری روایت لی ہے جس میں آتا ہے کہ حضور نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابو الاسود جمحی بھی ہے۔) (المواہب ج ۱، ص ۳۰۲)

کندھے اور سینہ

"سینہ چوڑا — سینہ اور پیٹ ہموار" (ہند بن ابی ہالہ)

"سینہ چوڑا" (براء بن عازب)

"مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے ذرا زیادہ" (ہند بن ابی ہالہ، براء بن عازب)

"کندھوں کا درمیانی حصہ پر گوشت" (حضرت علی)

بازو اور ہاتھ

"کلائیاں دراز — ہتھیلیاں فراخ — انگلیاں موزوں حد تک دراز" (ہند بن ابی ہالہ)

"ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے میں نے چھوا ہو اور وہ حضور کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو" (حضرت انس)

قدم

"پنڈلیاں پر گوشت نہ تھیں۔ ہلکی ہلکی ستی ہوئی" (جابر بن سمرہ)

"ہتھیلیاں اور پاؤں پر گوشت — تلوے قدرے گہرے — قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے" (ہند ابی ہالہ)

"ایڑیوں پر گوشت بہت کم" (جابر بن سمرہ)

ایک جامع لفظی تصویر — یوں تو حضور کے متعدد رفقاء نے حضور کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش

گئے ہیں لیکن ام معبد نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وادیٔ ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافرِ حق جب اپنی منزلِ اول (غار ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قوم خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضور اور آپ کے ہمراہی پیاسے تھے فیضانِ خاص تھا کہ مریل سی بھوکی بکری نے اس لمحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضور نے بھی پیا اور کچھ بچ رہا۔ ام معبد کے شوہر نے گھر آکر دودھ دیکھا تو اچنبھے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا۔ ام معبد نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر ام معبد نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ ام معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا نہ کسی طرح کا تعصب، بلکہ جو کچھ دیکھا من و عن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے اس کا جو ترجمہ مولف رحمۃ للعالمین نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ توند نکلی ہوئی، نہ چندیا کے بال گرے ہوئے، زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ، گویا دل بستگی لئے ہوئے، دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشی الفاظ سے معرّیٰ، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی۔ میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے۔ نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، زیبندہ منظر، والا قدر، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں جب وہ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں۔ جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لئے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن، نہ فضول گو۔

معراج

بتاؤں آ میں تجھے اصل بخششِ معراج
نہ راہبی، نہ فقیری، نہ مسلکِ شاہی
عطا ہوئے تھے سرِ عرش بس یہی تحفے
مذاقِ علم نوازی، کمالِ آگاہی

آصف عارفی

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

حضور اکرم کا لباس

نعیم صدیقی

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قصر و طول، رنگت، معیار صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرم کے لباس کے بارے میں حضور کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضور کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضور نے لباس کے معاملے میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ۔ (اعراف - ۲۶)

[اے اولاد آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لئے مقرر کیا ہے اور لباس تقویٰ بہترین ہے۔]

دوسرا پہلو لباس کا سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم بأسکم (تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لئے قمیصیں اور زرہیں فراہم کیں۔ النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضور کا لباس ساتر تھا۔ زینت بخش تھا۔ اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا۔ وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا۔ اور ذوق سلیم کا ترجمان بھی۔ حضور کو کبر و ریاء سے بُعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا۔ انما انا عبد البس کما یلبس العبد: "میں تو بس ایک خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح سے لباس پہنتا ہوں"۔ ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لئے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی۔ (مشکوٰۃ) تہہ بند، قمیص، اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامت کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا۔ اس لئے اس سے سخت تنفر تھا۔ دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضور نے ممنوع ٹھہرایا۔ تاکہ امت میں اپنی خودی اور عزت نفس برقرار رہے۔ نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب بن سکے،

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

چنانچہ حضورؐ نے اسلامی تمدن کے تحت نشست، آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، نظافت و نفاست اور وقار کا حضورؐ کو خاص لحاظ تھا اگر ہم حضور کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آیئے حضور کے لباس پر ایک نگاہ ڈالیں۔

کرتا (قمیص) بہت پسند تھا، کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی، سفر (خصوصاً جہاد) کے لئے جو کرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا۔ جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے۔ اور اس حالت میں نماز پڑھتے۔ کرتا پہنتے ہوئے پہلے سیدھا ہاتھ ڈالتے پھر الٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے۔ (داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کا استعمال حضور کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے)

عمر بھر تہبند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) رکھتے۔ سامنے کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں)، اور وہ آپ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کو ساتھ لئے ہوئے حضور بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لئے ایک خاص وزّان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے تولو۔ (اتّزن وارجح) وزان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے توجہ دلائی۔ الا تعرف نبیک، تم اپنے نبی پاک کو پہچانتے نہیں۔ وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا۔ تو آپ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہر حال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابوہریرہ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا آپ اسے پہنیں گے؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہوگا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہل فارس کا لباس تھا۔ اور تشبہ سے حضور کا اجتناب معلوم تھا۔ (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزاء کو حضورؐ قبول فرماتے تھے) آپ نے جواب دیا ہاں پہنوں گا سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظ ستر کا

حکم دیا گیا ہے۔ اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی نہیں"۔

سر پر عمامہ باندھنا پسند خاص تھا۔ نہ بہت بھاری ہوتا تھا نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے ۷ گز لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان رہتا۔ آخری پلو پیچھے کے رخ اڑس لیتے۔ تمازت آفتاب سے بچنے کیلئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لیکر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ بربنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لئے ایک خاص کپڑا (عربی نام "قناع") بالوں پر استعمال کرتے۔ جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا یہ حال تھا کہ (روایت میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً مٹیالا خاکستری مائل یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے۔ اور فتح مکہ کے موقعہ پر سیاہ بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بموجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا۔ اور اسے آپ نے مشرکین کے مقابلے پر امتیازی نشان قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی۔ سفر پر نکلتے تو اٹھی ہوئی باڑ دار ٹوپی استعمال فرماتے، سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔

اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی ۲½ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے۔ کبھی ایک پلو سیدھے بغل سے نکال کر الٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے۔ اور بعض مواقع پر اسے تہہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لئے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حبرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی۔ اس میں سرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں ایک مرتبہ حضور کے لئے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے اسے نہیں اوڑھا۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے احتیاطاً گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپ ہی نے مسلسل تربیت کر کر کے برسوں میں بلند کیا، کوئی

جوں وغیرہ نہ اٹکسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی، وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپ کو وجاہت کا سباب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے۔ کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو۔ سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیب بدن فرمایا۔ آپ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جبہ بھی پہنا۔ سرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیب تن کیا۔ طیلسانی قسم کا کسروانی جبہ بھی کبھی کبھی پہنا جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ اور ایک بار ۲۰ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا۔ اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قول قرآنی کی کہ "پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا" بس یہ ہے کہ معمول عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لئے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا۔ فرمایا "حق یہ ہے کہ تمہارے لئے مسجدوں میں بھی اور قبروں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے" فرمایا "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مردوں کو کفن دو۔ کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں"

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا۔ لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا، لیکن ہلکے سرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپ نے پہنے۔ ہلکا زرد، (مٹیالا یا شتری)، رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضورؐ کا جوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا، دوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت ۲ انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں تسموں کے درمیان بیچ پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنے کبھی بیٹھ کر بھی پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی، شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کئے

(باقی صفحہ ۴۴ کے نیچے)

حضورؐ کی وضع قطع اور آرائش

نعیم صدیقی

حضورؐ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے، ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے۔ کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے زائد بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے، اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے زائد بال بنفس نفیس تراشے۔ فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اکرمہا" (ان کو سنوار کر رکھو)

یہ تاکیدیں حضورؐ نے اس لئے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً رنگ تصوف جب بڑھتا ہے، اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ رہنا علو مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سدباب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں۔ اور بستر کے قریب، (۱) تیل کی شیشی، (۲) کنگھا

ع۴ کئے تھے۔ ان کو آپ نے پہننے تک استعمال فرمایا۔ چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا کبھی حبشی پتھر کا بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پتر یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی . . . (اور زیوں) سے آپ نے کراہت فرمائی ہے انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضورؐ خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے بنوائی تھی اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

(۲) ہاتھی دانت کا بھی، (۳) سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی)، (۴) قینچی (۵) مسواک (۶) آئینہ (۷) لکڑی کی ایک پتلی کھپچی۔

سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالتے۔ آخر رات میں حاجات سے فارغ ہوکر وضو کرتے۔ لباس طلب کرتے اور خوشبو لگاتے، ریحان کی خوشبو پسند تھی مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مشک اور عود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گرم خوشبو دار دھونی لیا کرتے۔ ایک عطر دان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہؓ اپنے دست مبارک سے خوشبو لگاتیں)، مشہور بات ہے کہ آپ جس کوچے سے گزر جاتے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی! اور فضائیں بتاتی تھیں کہ گذر گیا ہے ادھر سے وہ کاروانِ بہار۔ خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے تحت آپ نے مردوں کے لئے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے اور عورتوں کے لئے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو۔ مہک مخفی رہے۔

رفتار۔ حضورؐ کی چال عظمت، وقار، شرافت، اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے، ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا، دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اتر رہے ہیں ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں "گویا زمین آپ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹی جارہی ہے"! رفتار تیز ہوتی قدم کھلے کھلے رکھتے۔ آپ معمولی رفتار چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے"! حضورؐ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ "زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو"! (سورہ لقمان)

تکلم۔ تکلم انسان کے ایمان، علم، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت آواز کا اتار چڑھاؤ لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علم بردار ہے۔

حضورؐ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا

رُوحی فداہٗ کا اندازِ تکلم

نعیم صدیقی

لیکن آپ ایک داعی تھے۔ اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لئے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لئے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لئے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہٰذا دوسری طرف صورت حال حضرت زید بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ "جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضورؐ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے۔" اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی وما ینطق عن الھویٰ کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ ام معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی۔ "الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ"

---

۴ گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضورؐ کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپ تفکرات اور مسائل مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے، اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے، لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلنا ملنا بھی رہتا۔ اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضورؐ کی ذات تھی ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری ایک سلطنت کے مسائل، ایک جماعت اور معاشرے کے معاملات اور پھر اپنے خلصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنہیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسن اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ "وہ اللہ کے رسولؐ متواتر پریشانیوں میں رہتے، ہمیشہ مسائل پر غور کرتے رہتے، کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا، دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات

"نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو" تاکید، تفہیم اور تسہیل حفظ کے لئے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے بھی تھے بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے۔ مکروہ اور فحش، اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن حارث کا بیان ہے کہ میں نے حضور سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا۔ یہ مسکراہٹ حضور کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی اور رفقا کے لئے وجہ جاذبیت ہوتی بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے۔ ورخاص جملوں کو بار بار دہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے، بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (Gestures) سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لئے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آرپار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے۔ کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصہ پر مارتے، کبھی سر ہلاتے، اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی وحی کی لسانِ مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق ہے کہ حضور افصح العرب تھے حضور کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی۔ اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہئے کہ حضور نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی۔ ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضور کے ایک قول (الحرب خدعة) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "ھی لغۃ النبی" یہ نبی اکرم کی مخصوص زبان تھی۔ بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا۔ اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو نہد کے لوگ آئے تو گفتگو رہی جس کے

سردار نے دعوت دین کی خصوصی پیشکش

دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا "اے اللہ کے نبی ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟" فرمایا اور خوب فرمایا "ان اللہ عز وجل ادبنی فاحسن ادبی ونشات فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عز وجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنادیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے)، ایک موقعہ پرکسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابوبکر تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؟ حضور نے وضاحت کی اس پر جناب صدیق کہنے لگے: میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے لیکن آپ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا" یہاں بھی وہی بات حضور فرماتے ہیں "ادبنی ربی ونشات فی بنی سعد"

اسی طرح حضرت عمر ایک بار کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں۔ حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے" فرمایا "کانت لغۃ اسمٰعیل قد درست فجاء لی بہا جبرئیل فحفظنیہا" (میری زبان اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبرئیل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی)۔ مطلب یہ ہے کہ حضور کی زبان معمولی عربی نہ تھی۔ بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسمٰعیلی زبان سے ملتا تھا۔ اور جبرئیل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے۔ کہ اکابر تاریخ خصوصًا انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

حضور کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپ کو "جوامع الکلم" عطا کئے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اعطیت بجوامع الکلم" جوامع الکلم حضور کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالم اپنی مثال آپ تھے۔ اور اسے خصوصی عطیات رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے۔

(۱) "المرء مع من احب" آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

(۲) "اَسلِم تَسلَم" تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے۔ (دعوتی خط بنام ہرقل روم)

(۳) "انما الاعمال بالنیات" اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

(۴) "لیس للعامل من عملہ الا ما نواہ" کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

(۵) "الولد للفراش وللعاھر الحجر" بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے اور زانی کے لئے پتھر۔

(۶) "الحرب خدعۃ" جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

(۷) "لیس الخبر کالمعاینۃ" شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

(۸) "المجالس بالامانۃ" مجالس کے لئے امانت (رازداری) لازم ہے۔

(۹) "ترک الشر صدقۃ" برائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۰) "سید القوم خادمھم" قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

(۱۱) "کل ذی نعمۃ محسود" ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

(۱۲) "الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ" حسن گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۳) "من لا یرحم لا یُرحم" جو مخلوق پر خصوصاً انسانوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا کی بارگاہ سے رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشادات رسالت مآب بلحاظ الفاظ، بلحاظ اسلوب، بلحاظ روح بالعموم پہچانے جاتے ہیں اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضور کے جوامع الکلم ہیں وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آہنگ گٹھاؤ، ان میں معنوی گہرائی، دل پر اثر کرنے والی روح اخلاص کلام نبوی کے امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کئے جائیں۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

"میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ نظام اجتماعی کے لئے سمع وطاعت کی تاکید کرتا ہوں خواہ (اسے چلانے کے لئے) کوئی حبشی غلام ہی (برسر قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہوں گے۔ پس (ایسے حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو اس کو مضبوطی سے تھام (اسے دانتوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

عمرو بن عبسہ نے حضور سے کچھ باتیں کیں جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضور نے دیئے اس چھوٹے سے مکالمہ کو ملاحظہ کیجئے۔

"اس (دعوت و تحریک کے) کام میں (ابتداً) کون کون آپ کے ساتھ تھا؟"

"ایک مرد آزاد (مراد حضرت ابو بکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلال رضؓ)"

"اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟"

"پاکیزہ گفتار اور بھوکوں کو کھانا کھلانا۔"

"ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟"

"صبر اور سخاوت۔"

"کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

"کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟"

"جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔"

"کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟"

"جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے۔"

"کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟"

سہ روزہ دعوت۔ دہلی کی خصوصی پیشکش

"ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں"۔

"کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے"۔

"کونسی گھڑی (عبادت کیلئے) سب سے بڑھ کر ہے؟"

"رات کا پچھلا پہر"۔

ایک بار دریافت کیا گیا کہ انسانوں کو دوزخ تک پہونچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟ فرمایا "الفم والفرج" یعنی دہن اور شرمگاہ، دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف، اور شرمگاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف، یعنی کلام کا فاسد ہونا، روزی کا ناپاک ہونا اور جنسی جذبات کیلئے راہ رو ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور لڑائیاں اور زیادتیاں اور ظلم بھی انہی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپ اپنے مسلک کی وضاحت کریں آپ نے مختصر اور فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرز فکر، اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے، ملاحظہ ہو:

"المعرفة رأس مالي، والعقل اصل ديني، والحب اساسي، والشوق مركبي، وذكر الله انيسي، والثقة كنزي، والحزن رفيقي، والعلم سلاحي، والصبر ردائي، والرضاء غنيمتي، والعجز فخري، والزهد حرفتي، واليقين قوتي، والصدق شفيعي، والطاعة حسبي، والجهاد خلقي وقرة عيني في الصلوٰة"

ترجمہ: عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکر الٰہی میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لئے وجہ اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے، (لقا قوت ہو تو غذا ہے) صدق میرا سفارشی ہے، طاعت میرا بچاؤ ہے، جہاد میرا کردار ہے، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔

حسن تمثیل کی بیشمار زریں مثالیں آپ کے کلام میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپ نے بدوؤں کے

ذہن نشین کرادیئے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجئے۔

"مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دیکر اٹھایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر موسلا دھار بارش ہو۔ پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پوری طرح جذب کیا اور مرجھایا ہوا سبزہ اس سے تر و تازہ ہوگیا۔ اور نئی بوٹیاں کثرت سے اگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اپنے اندر جمع کر رکھا۔ اور اللہ نے اسے لوگوں کے لئے مفید بنایا۔ انہوں نے اس کو پیا پلایا اور کھیتوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور ٹکڑے پر برسا جو چٹیل میدان تھا۔ اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا نہ جذب کر کے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے علم دین میں سوجھ بوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دیکر اللہ نے اٹھایا ہے اس سے اسے فائدہ پہونچا۔ اس نے خود علم حاصل کیا، اور دوسروں کو سکھایا دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس دعوت کو سنکر سر نہیں اٹھایا۔ اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا۔ جو میرے ذریعہ بھیجی گئی ہے۔"

آپ کے انداز گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جاسکتا ہے تو قرآن کے اس جملے کو کہ "قولوا للناس حسنا" لوگوں کو حسن تکلم سے خطاب کرو۔ آپ کا حسن کلام سادگی کی شان لئے ہوئے تھا بناوٹی کلام سے آپ کو بُعد تھا فرمایا:۔

البعدکم منی یوم القیامۃ الثرثارون	تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھے
المتشدقون والمتفیھقون۔	انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بول
. . . .	بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے
. . . .	والے ہیں۔

اسی طرح آپ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی ـــــ حضورؐ کے چمن زار تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لعالی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ روئی سے آپ ہی کا چہرا آراستہ رہتا تھا۔ باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب اور ہر آن کی پریشانیوں کے خار زار در پیش تھے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

یہ زندگی ــــــ!

از
ابو محمد امام الدین رام نگری

یہ عنوان جتنا مختصر ہے اتنا ہی وسیع اور اہم ہے ۔

یہ زندگی، یہ سادہ زندگی، یہ پاکیزہ، و معصوم زندگی، یہ مقدس و محترم زندگی، یہ باعظمت اور عظیم الشان زندگی، کتنی عجیب و غریب اور بے مثل و بے نظیر ہے یہ زندگی، یہ متاہل زندگی، یہ مجرد زندگی یہ زاہدانہ زندگی، یہ شاہانہ زندگی، یہ شب بیدارانہ زندگی، یہ کشورکشانہ زندگی، یہ معلمانہ زندگی، یہ ہادیانہ زندگی، یہ پرسکون زندگی، یہ غلغلہ انگیز زندگی، یہ امن پسندانہ زندگی، یہ جنگ جویانہ زندگی، یہ نفس شکن زندگی، یہ صف شکن زندگی، یہ زندگی کتنی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔ یہ اپنی نوعیت میں افسانہ ہے اور اپنی واقعیت میں حقیقت! یہ بے مثال زندگی ہے، یہ لازوال زندگی ہے، یہ ابدی اور لافانی زندگی ہے دائمی اور باقی زندگی ہے، یہ وسیع ہے، ہمہ گیر ہے، بلند ہے، جامع ہے، ہمہ جہتی ہے اور عالمگیر ۔!

ایسی عظیم زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اور اس کی تعلیم و تربیت میں گھر سے کیا ملا؟ خاندان سے کیا ملا؟ قوم سے کیا ملا؟ وطن سے کیا ملا؟ اور کیا ملا دنیا سے؟ گھر میں کیا تھا؟ خاندان میں کیا تھا؟ قوم میں کیا تھا؟ وطن میں کیا تھا؟ ملک میں کیا تھا؟ اور دنیا ہی میں اس کے شایان شان کیا تھا؟ خاندان اور قوم میں وطن اور ملک میں دور دورہ تھا۔ جہالت و سفاہت کا، ضلالت و گمراہی کا، بداخلاقی و بدکرداری کا، فسق و فجور کا، شراب و زنا اور جوئے کا، عداوت و دشمنی کا، جبر و تشدد کا، ظلم اور بے انصافی کا، قتل اور غارت کا، چوری اور لوٹ کا، دنیا میں کبھی یہی سب کچھ تھا اور بڑے پیمانے پر، اور ہولناک صورت میں بڑے بڑے ممالک تھے، بڑی بڑی قومیں تھیں، بڑی بڑی حکومتیں اور سلطنتیں تھیں، بڑی بڑی تہذیبیں تھیں، بڑے بڑے تمدن تھے اور بڑے بڑے علوم و فلسفے، بڑے بڑے علماء و حکماء تھے، بڑے بڑے ادیان و مذاہب تھے، بڑے بڑے احبار و رہبان تھے، بڑے بڑے پنڈت اور شاستری، لیکن ان سب کا

حاصل بھی کیا تھا۔ وہی ضلالت و گمراہی کفر و شرک کا دور دورہ تھا۔ ساری دنیا میں انسان معبود بنے ہوئے تھے۔ ان کی پوجا ہو رہی تھی، وہ خدائی کر رہے تھے ان کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ ڈنڈوت کئے جاتے تھے ہاتھ جوڑے جاتے تھے جانوروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ آگ پانی اور درخت کی پوجا ہو رہی تھی۔ سورج چاند اور ستاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ جنوں بھوتوں اور فرشتوں کی پوجا ہو رہی تھی، مخلوق پرستی کا وہ زور تھا ہر شے معبود بن گئی تھی۔ اور اس پوجا پرستش کی پیاس اتنی بڑھ گئی تھی کہ اتنے سے بھی تسکین نہ ہوتی تھی کتنی خیالی ہستیاں معبود بنا لی گئی تھیں۔ جن کا کوئی وجود نہ تھا اس کے علاوہ وہ بیشمار مفاسد عام تھے جن کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں فسق و فجور، بدکاری و بد اخلاقی، ظلم و بے انصافی، جبر و تشدد، جنگ و جدل عام نہ ہو۔ رقص و سرود سے بادشاہوں اور راجاؤں کے دربار ہی آراستہ نہ ہوتے تھے رقص و سرود مذہب اور دھرم کے لوازم میں داخل تھے۔ دیوتاؤں کے سامنے بھی گانے اور ناچ کے جلسے جمتے تھے۔ اور بھگت ان سے اپنے ٹھنڈے جذبات کے لئے گرمی حاصل کرتے تھے۔ فسق و فجور نے معبدوں خانقاہوں، مندروں اور مٹھوں میں اڈے جما لئے تھے۔

بھلا ایسی دنیا سے اس زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لئے بھی کچھ مل سکتا تھا۔ پھر یہ زندگی کیسے بنی؟ اور اس کی تعمیر و تشکیل کیسے ہوئی؟ اور یہ کیسے پروان چڑھی؟

یہ بڑا مشکل سوال ہے مگر بڑا آسان۔ اس زندگی کی ایک تفصیلی تاریخ موجود ہے جس میں اس زندگی کا ایک ایک جزو، ایک ایک پہلو موجود ہے۔ اس سے صاف، اس سے مفصل، اس سے واضح اس سے روشن اور اس سے یقینی دنیا میں کوئی تاریخی زندگی موجود نہیں ہے۔ اس کا سونا جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا چلنا، پھرنا، اس کے بال بال کی تاریخ موجود ہے۔

یہ زندگی پیغمبرانہ زندگی ہے پیغمبرانہ زندگی کی تعمیر و تشکیل گھر نہیں کرتا، خاندان نہیں کرتا، قوم نہیں کرتی ملک و وطن نہیں کرتے اور دنیا بھی نہیں کرتی۔ پیغمبرانہ زندگی کی تعمیر و تشکیل اور تعلیم و تربیت براہ راست خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی اس کی تربیت کرتا ہے اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔

پیغمبر گھر سے، خاندان سے قوم سے، ملک سے اور دنیا سے کچھ لینے نہیں آتا، سب کو دینے آتا ہے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

کسی سے کچھ سیکھنے نہیں آتا، سب کو سکھانے آتا ہے۔ اس کا کوئی معلم و رہنما نہیں ہوتا۔ وہ خود سب کو تعلیم دیتا اور رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کسی کی تقلید و پیروی نہیں کرتا، وہ سب کا مقتدا ہوتا ہے۔ اور سب کو اپنے پیچھے چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ تو یہ پیغمبرانہ زندگی ہے۔ تمام جہان کی ہادی و رہنما اور تمام پیغمبروں کی زندگیوں کی جامع، چنانچہ اس زندگی نے کسی سے کچھ نہیں لیا۔ مگر دیا سب کو، اور وہ اب تک دنیا کو اپنا فیضان لٹا رہی ہے اور رہنمائی کر رہی ہے۔

اب آیئے ذرا دیکھیں یہ زندگی کیا تھی؟ کیا بن گئی؟ اور کیسے بنی؟ اس نے دنیا میں کیا کیا کیا؟ دنیا کو کیا کیا دیا۔ اور دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا؟۔

وہ ماں کے شکم ہی میں تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ پیدائش اس تنگحالی میں ہوئی کہ ملک کے دستور کے مطابق دیہات سے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے بچے حاصل کرنے کی غرض سے دائیاں آئیں تو کسی دائی نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اسے مجبوراً وہ دائی لے گئی جسے کوئی خوش حال بچہ نہ ملا۔ دیہات میں اس کی پرورش ہوئی وہ ادھر ادھر چلنے پھرنے اور دوڑنے کے لائق ہوا تو اس کا دلچسپ مشغلہ دائی کی بکریوں کا چرانا تھا اس نے لڑنا جھگڑنا نہ سیکھا، کیونکہ اسے آوارہ انسانیت کو راہ پر لانا اور دنیا کو امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا پیغام دینا تھا۔

وہ ابھی ۶ ہی برس کا تھا کہ ماں کی آغوش بھی چھن گئی، دادا کے زیرِ سایہ آیا وہ بھی سر سے اٹھ گیا، چچا جو خود بھی عیال دار اور تنگ حال تھا اس کا کفیل ہوا۔ وہ اسی حالت میں جوان ہوا، اس کی جوانی بھی بڑی عجیب ہے تمام ماحول بدکرداری و بداخلاقی میں ڈوبا ہوا ہے، ہر گھر شراب سازی کا چھوٹا سا کارخانہ ہے، داشتاؤں کا رکھنا لازمۂ ریاست و امارت کا ایک خاص جز ہے۔ شراب اور جوئے کی صحبتیں بڑی دھوم سے گرم ہوتی ہیں لیکن یہ نوجوان ان میں سے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کو ایسی ہر شئے سے نفرت ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان بتوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتا جو شہر و دیار کے چپے چپے پر خدائی کر رہے ہیں اور جو خدا کی جگہ پوجے جا رہے ہیں۔ جو قوم و ملک کی زندگیوں کے بنانے بگاڑنے والے، زندگی اور موت دینے والے نفع اور نقصان پہونچانے والے مانے جاتے ہیں۔ جیسے وہ نوجوان کسی اور ہی دنیا کا رہنے والا ہو، اس دیار میں

کھول کر آگیا ہو۔

یہ کتنی حیرت انگیز زندگی ہے اس زندگی میں ایسی کسی خرابی اور برائی کا شائبہ بھی نہیں ہے مگر وہ تمام اچھائیاں اور خوبیاں اس میں موجود ہیں جن سے اس کا ماحول خالی ہے اس نے اپنی نیکی شرافت سعادت مندی، نیک طینتی اور راستبازی سے خاندان اور قوم میں ایک ایسی امتیازی حیثیت حاصل کرلی کہ چھوٹے بڑے سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ اور اس کو "صادق" اور "امین" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس شرف و امتیاز میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

شہر میں ایک معزز بیوہ خاتون ہیں، ایک بڑی تجارت اور کاروبار کی مالک، لوگ تجارت کا مال لے کر باہر جاتے ہیں ان خاتون کو ایک ایسے متدین اور امانتدار آدمی کی ضرورت ہے جو منافع کی شرکت پر ان کا تجارتی مال لے کر باہر جائے۔ ان کی نگاہ انتخاب اسی نوجوان امین پر پڑی، چچا کے مشورے کے مطابق خاتون کی درخواست منظور کرلی گئی۔ تجارت کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے لیکن تمام مال معقول منافع کے ساتھ فروخت ہوجاتا ہے اور پائی پائی رقم خاتون کے سامنے رکھدی جاتی ہے۔ خاتون خوش ہوجاتی ہیں۔ اور خاتون کا جو غلام ساتھ گیا تھا وہ بھی خاتون سے نوجوان کی صداقت و دیانت کی دل کھول کر تعریف و تحسین کرتا ہے۔

معزز خاتون سوچتی ہیں اگر ایسا شریف اور نیک طینت انسان شریک زندگی بننا قبول کرلے تو کتنی خوش نصیبی کی بات ہو۔ وہ اپنی سہیلی سے نوجوان کے پاس پیغام نکاح بھیجتی ہیں اور چچا کے مشورے سے یہ پیغام قبول کرلیا جاتا ہے چچا کو معلوم ہے یہ خاتون قوم میں کتنی معزز اور شریف سمجھی جاتی ہیں۔ اور اپنی سیرت و اخلاق کی بناپر طاہرہ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں قوم کے کتنے امراء و رؤسا ان سے نکاح کرنے کے خواستگار ہیں اور پیغام دے چکے ہیں مگر انھوں نے کسی کے پیغام کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔ کیا ہوا جو بھتیجے کی عمر ۲۵ برس کی ہے اور وہ چالیس سال کی ہیں۔ نیک اور شریف تو ہیں۔ نوجوان بھتیجے کو بھی نفس پرستی کی ضرورت نہیں ہے ضبط نفس کی ضرورت ہے یہ رشتہ استوار ہوگیا اور معیاری حد تک کامیاب ہوا۔ وفا شعار بیوی نے اپنا سب کچھ پاک طینت شوہر کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور شوہر نے اس حسن معاشرت کا نمونہ پیش

کیا جو قوم میں بے مثل تھا۔

اس رشتے پر پندرہ سال گذر چکے ہیں۔ انتہائی خوش گواری، یکجہتی، وفا شعاری، اور مہر و محبت کے ساتھ اس عرصے میں کئی اولادیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ پوری عائلی زندگی نمونے کی زندگی ہے۔

بچپن، جوانی، تجارت، مناکحت اور اہل و عیال کے مراحل سے گذرتی ہوئی یہ زندگی چالیس برس پورے کر چکی ہے۔ کہ اس میں ایک ایک انقلاب ہوتا ہے، بڑا ہی عجیب و غریب انقلاب، قلب کی گہرائی سے ایک سوچ ابھرتی ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ یہ تہ بہ تہ سوالات لئے ہوئے۔ اور سوالات بھی معمولی نہیں، انتہائی غیر معمولی، صحرائی ملک کا صحرائی شہر، جہاں نہ کوئی تعلیم گاہ ہے نہ کوئی صاحب علم و فضل، نہ علم و فضل کا کوئی چرچا، نہ کوئی فلسفی و حکیم، لیکن یہ زندگی سر تا پا سوال بن جاتی ہے اور سوالات کیسے؟ یہ آسمان کیا ہے؟ یہ زمین کیا ہے؟ اس نیلے سائبان کا معمار کون ہے؟ زمین کا یہ فرش کس کا بچھایا ہوا ہے؟ یہ روز صبح کو طلوع ہونے والا آفتاب کیا ہے اور شب میں بڑھنے گھٹنے والا چاند کیا؟ اور کیا ہیں یہ جگمگ جگمگ کرنے والے ستارے؟ یہ زمین پر اونچے اونچے پہاڑ کیا ہیں؟ صحرا کیا ہے؟ چشمے کیا ہیں؟ ان گنت قسم کے پیڑ اور پودے کیا ہیں؟ اور کیا ہیں یہ انسان؟ ان سب کو کس نے بنایا ہے؟ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ اور کون ہے ان کا مالک؟ کائنات کے اس عظیم کارخانے کو کون چلا رہا ہے؟ اور اس کی انتہا کیا ہے؟ غرض و غایت کیا ہے؟ کیوں بنائی گئی ہے یہ کائنات؟ اس میں انسان کا مقام کیا ہے — ؟ اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ بس پیدا ہونا، کھانا پینا، شادی اور بچے پیدا کرنا؟ دنیا کے مزے اڑانا، اور مر کر مٹی میں مل جانا؟ اور یہ بت کون ہیں جن کی پوجا ہو رہی ہے؟ جن کے ناموں کے نعرے لگائے جاتے ہیں؟ جے بولی جاتی ہے؟ جن سے ڈرا جاتا ہے؟ جن کو خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے؟ جن سے مرادیں مانگی اور امیدیں رکھی جاتی ہیں؟ یہ بے جان بت، پتھر کے ٹکڑے، انسان کے ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیاں خود ساختہ معبود، یہی کائنات کی خالق و مالک ہیں؟ — اور یہی اس کارخانۂ کائنات کو چلا رہے ہیں — بے اختیار بت؟ پھر کیا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں؟ کیا یہ خود زاد ہے؟ یہ کارخانہ اس نظم و ضبط کے ساتھ از خود جاری و ساری ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ پھر اس کا خالق و مالک کون ہے؟ اس کا

پتہ کون بتائے؛ اس کو کون سی بات پسند ہے اور کون سی ناپسند۔ اس کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ یہ کیسے معلوم؟

اس کے اندر ایک بے پناہ جذبۂ جستجو پیدا ہو گیا جو اسے ہر وقت ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھتا تھا۔ یہ ذہنی کشمکش اتنی شدت اختیار کر گئی کہ اس کا دل شہر سے بیزار ہو گیا۔ اس کی طبیعت ماحول سے اِبا کرنے لگی۔ اب اسے شہر اور ماحول سے زیادہ ایک غار عزیز تھا۔ جو آبادی سے میلوں دور پہاڑ میں واقع تھا۔ یہ گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کی زاہدانہ زندگی تھی جو دانے اور ستو پر گذرتی تھی۔ کھانے کا سامان ختم ہوتی پر گھر آنا ہوتا اور پھر وہی غار، وہی اسرار کائنات کی دریافت کی تڑپ، تفکر و تدبر اور فطرت سلیم کے مطابق کائنات کے خالق و مالک کی قلبی یاد۔

اسی حالت میں کتنے دن گذرے، کتنی راتیں گذریں، کتنے ہفتے اور مہینے گذر گئے۔ لیکن تشنگی تھی کہ بڑھتی ہی گئی جذبۂ جستجو تھا کہ بھڑکتا ہی گیا۔ ذوقِ طلب تھا کہ ترقی ہی کرتا گیا۔ آخر وہ وقت سعید آیا کہ شب سعی و طلب کی صبح نمودار ہوئی، پردۂ غیب چاک ہوا، ایک آسمانی روشنی ظاہر ہوئی جس سے غار جگمگا اٹھا۔ کوہ و صحرا روشن ہو گئے۔ ساری فضا روشن ہو گئی۔ یہ خدا کے فرشتے کا ظہور تھا جبرئیل امینؑ کا، جو نوحؑ کے پاس بھی آیا تھا، ابراہیمؑ کے پاس بھی، موسیٰ، داؤد اور عیسیٰؑ کے پاس بھی آیا تھا۔ اور تمام ان برگزیدہ . . انسانوں کے پاس جن کو دنیا خدا کے رسولوں اور نبیوں کے نام سے جانتی ہے۔ روح القدس!

اس امین فرشتے نے اس برگزیدہ ازلی انسان کو خدا کا پیغام سنایا جو خود بھی اپنی فطرت میں امین تھا اور قوم سے امین کی سند پا چکا تھا۔ اور جسے خدا نے ازل ہی میں اپنی رسالت کے لئے چن لیا تھا۔ فرشتے نے خدا کا کچھ کلام سکھایا اور عبادت کا طریقہ بھی جسے نماز کہتے ہیں۔

اس پیغام نے ذہن کی ساری گرہیں کھول دیں، سارے سوالات حل کر دیئے۔ اب روشنی ہی روشنی تھی کہیں کوئی تاریکی نہ تھی۔ کائنات کے رازہائے سربستہ بے نقاب ہو گئے، کائنات بے خدا نہیں ہے خود بخود وجود میں نہیں آ گئی ہے یہ کارخانہ بھی آپ سے آپ نہیں چل رہا ہے۔ زمین کا، آسمان کا، سورج کا، چاند کا، ستاروں کا، کوہ و دشت کا، بحر و بر کا، پیڑ پودوں کا، انسان حیوان کا، سب کا ایک خالق ہے۔

وہی اس کا سلطان و فرماں روا بھی ہے۔ خالقیت اور حاکمیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے وہ یگانہ اور بے ہمتا ہے۔ اسی کا دست قدرت اس کارخانے کو چلا رہا ہے۔ ساری کائنات میں اسی کا حکم جاری و ساری ہے کائنات کی ہر مخلوق کے لئے اس کی خلقت اور مقصد زندگی کے مطابق سلطان کائنات کا ایک قانون ہے۔ انسان کے لئے بھی اس کے قوانین ہیں اور ان کے نتائج و خواص بھی۔ اس نے ہر زمانے میں، ہر ملک میں اور ہر قوم میں اپنے رسول اور نبی بھیجے، ان کا کام تھا خدا کے احکام و قوانین کو انسانوں تک پہونچانا، اور ان کو خبردار کرنا کہ انسان خدا کی مخلوق ہے۔ اس کے گرد و پیش جتنی چیزیں ہیں سب خدا کی مخلوق ہیں۔ جو چیزیں اس کی دسترس میں ہیں اور جو اس کی دسترس سے باہر اس کے کام میں لگی ہوئی ہیں سب خدا کی ملک ہیں۔ وہ جن چیزوں کو استعمال کر رہا ہے اور جن سے اس کو فائدہ پہونچ رہا ہے ان کو استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے خدا کے احکام و قوانین ہیں۔ زندگی گذارنے کے لئے تعلیم و ہدایات ہیں۔ اس کی مرضی اور خوشنودی اس میں ہے کہ انسان اس کے احکام و قوانین اور اس کی تعلیم و ہدایت کی پیروی کرے اسی میں اس کی فلاح و سعادت ہے اور اس کے خلاف میں اس کی شقاوت و بدبختی۔

خدا کے رسولوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ ساری کائنات ابدی اور جاوداں نہیں ہے یہ ایک روز فنا ہو جائے گی نسل انسانی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ ہستی اور فنا ایک جدید خلقت کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی ایک نئی زمین وجود میں آئے گی۔ ایک نیا آسمان خلقت میں آجائے گا اسکی قدرت نے پہلی بار انسان کو پیدا کیا تھا اسی کا کمال قدرت۔۔۔ تمام مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرے گا سارے انسانوں کی اس کے حضور پیشی ہوگی۔ جس نے اس کے رسولوں کی پیروی کی ہوگی اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی کی زندگی گذاری ہوگی اس کے لئے اس کی خوشنودی ہوگی۔ اور بے پایاں انعام و صلہ ہوگی؛ ور جس نے اس کے رسولوں کا انکار کیا ہوگا اور اس کے احکام و قوانین اور تعلیم و ہدایت کو پس پشت ڈال کر خود پسندانہ زندگی گذاری ہوگی اس کے لئے اس کا غضب و غصہ ہوگا اور ناقابل تصور عقوبت و سزا ہوگی یہ پیغام اور یہ تعلیم و ہدایت انسان کو بار بار دی گئی تھی۔ اور اس نے بار بار بھلایا تھا اس وقت بھی دنیا نے اس تعلیم و ہدایت کو فراموش کر دیا تھا۔ خدا کا نام لینے والے اب بھی موجود تھے۔ مگر اس کو ماننے والے ناپید تھے۔

کہیں جہلِ مطلق تھا اور کہیں عالمانہ جہل جس نے فلسفہ اور حکمت کے نام پر ایک خدا کے بجائے بیشمار ... ۔ سب کا نتیجہ سب کا ایک تھا خدا سے غفلت اور مخلوق کی پوجا اور پرستش، خدا کے رسول کو انھیں ضلالت اور بھول بھلیوں سے انسان کو آزادی دلانا تھا۔

خدا کا رسول غار سے باہر نکلا۔ اب اس کی جگہ کوہ و صحرا نہیں تھے شہر تھا۔ ... تھے۔ اہلِ خاندان اہلِ شہر اور اہلِ ملک تھے جن سے بیزار ہو کر وہ غار میں چلا گیا تھا۔ اسے خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا پیغام دینا تھا۔ یہی اس کا منصب اور فریضہ تھا۔ وہ پہاڑ سے نیچے اترا، گھر آیا۔ اس نے اپنی وفا شعار رفیقۂ حیات کو غار کی سرگذشت سنائی، اور خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی دعوت دی، یہ کتنی اجنبی دعوت دی، ایک خدا اور اس کے رسول کی دعوت۔ یہ حقیقت جتنی پرانی تھی اتنی نئی بھی تھی یہ جتنی معلوم تھی اتنی ہی نامعلوم بھی بن گئی تھی۔ خاندان، قوم اور وطن سب جگہ ابراہیم و اسماعیل کے نام عام تھے خاندان اور قوم کے لوگ تو خدا کے انھیں برگزیدہ رسولوں کی اولاد بھی تھے۔ پھر بھی یہ قوم توحید و رسالت کو فراموش کر چکی تھی۔ اور ایک خدا کے بجائے بیشمار مادی اور خیالی خداؤں کو پوج رہی تھی اور دور دراز گمراہی میں جا پڑی تھی۔ اس کے وہم و گمان سے بھی یہ بات بعید تھی کہ کوئی انسان خدا کا رسول ہو سکتا ہے مگر خاتون بھی کتنی سلیم الفطرت اور نیک بخت تھیں۔ انہوں نے اس اجنبی دعوت توحید و رسالت کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کر دیا جیسے وہ اس سے ہمیشہ سے آشنا اور اس کی منتظر ہوں۔

رسولِ خدا کے ایک دوست بھی۔ صادق اور مخلص دوست، بڑے ہی نیک طینت اور پاکیزہ خصلت، رسولِ خدا نے ان کے سامنے بھی اپنی دعوت پیش کی، وہ بھی سراپا صدیق تھے رسولِ خدا کے چچا کے بیٹے تھے وہ ابھی تھے تو بالکل نوخیز، لیکن ان کی فطرت بھی بڑی سلیم اور سادہ تھی۔ بڑی آسانی سے ان کے لوحِ قلب پر یہ دعوت نقش ہو گئی۔ رسولِ خدا کے ایک آزاد کردہ غلام بھی تھے، بڑے قسمت کے دھنی، انہوں نے بھی اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اس طرح اس دعوت توحید و رسالت کی تاسیس ہوئی، شرک و کفر کے ماحول میں، اس ظلمت کدہ میں ہدایت کی ایک شمع روشن ہوئی، چراغ سے چراغ جلنے لگا اور روشنی تاریکی کے پردے کو چیرتی آگے بڑھنے لگی۔ رسولِ خدا کے دوست اس دعوت کی اشاعت میں

دست راست ثابت ہوئے، شہر کے کتنے افراد کو انہوں نے رسول خدا کے گرد جمع کر دیا

دیکھ رہے ہو اس زندگی کو؟ ایک دائی کے جنگل میں بکریاں چرانے والی زندگی شہر میں امین اور صادق کے نام سے پکاری جانے والی زندگی، تجارتی منڈی میں کاروبار کرنے والی زندگی، غار کی عزلت گزیں، عابد و زاہد کی زندگی اب ایک رسول، داعی حق معلم وحی و رسالت اور مصلح اخلاق کی زندگی بن گئی۔ اس زندگی کا یہ کتنا بڑا انقلاب تھا اور کتنے عظیم انقلاب کا آغاز۔

یہ بڑی ہی ابتلاؤ آزمائش کی زندگی تھی۔ ایک طرف فریضۂ دعوت تھا اور دوسری طرف تاحول نور و ظلمت کی ٹکر تھی۔ نور کو آگے بڑھنا تھا۔ ظلمت کو مٹانا تھا۔ صدیوں کی جمی اور چھائی ہوئی ظلمت اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہ تھی جس کو صادق اور امین کے محترم و معزز لقب سے یاد کیا جاتا تھا اس کی دعوت کی تکذیب کی جانے لگی جس کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اس کی تذلیل و تحقیر ہونے لگی۔ جو خلوص و محبت کا مرکز تھا وہ بغض و عناد اور ظلم و ستم کا ہدف بن گیا۔ لیکن اس کو اس کی پرواہ نہ تھی اس نے خاندان والوں کو گھر میں جمع کر کے اپنا پیغام سنایا، پھر پہاڑ پر کھڑے ہو کر ساری قوم کو پکارا، فریضۂ دعوت ادا کیا۔ اس کو ڈرایا گیا، دھمکایا گیا، اس پر ترغیب و تحریص کے داؤں کھیلے گئے۔ اس کے حامی و مددگار چچا پر دباؤ ڈالا گیا، اجتماعی دباؤ کہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن اس اولوالعزم داعی حق کو کوئی چیز اس کی راہ سے ہٹا نہ سکی۔ اس کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ شہر میں اس کا رہنا ناممکن بنا دیا گیا اس کو اپنے خاندان اور پیروؤں کے ساتھ پہاڑ کی گھاٹی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کو اتنا مایوس کیا گیا کہ وہ اپنے شہر کو چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں گیا، کہ وہیں کے لوگ اس کی دعوت قبول کر کے اس کی تائید و حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن وہ شہر کچھ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ وہاں اس کا سب و شتم اور تمسخر و استہزا سے خیر مقدم ہوا۔ اور ڈھیلے پتھر مار مار کر اس کو وہاں سے رخصت کیا گیا۔ یہ تھی اس کی داعیانہ زندگی: کیسی عجیب تھی یہ داعیانہ زندگی؟ اس کی قوم اسے مجنون کہتی تھی۔ ساحر کہتی تھی، کاہن کہتی تھی، ہاں وہ سب کچھ تھا، ایسی قوم اور ایسے ماحول میں دعوت کا یہ جنون دنیا پرستوں کی نگاہوں میں یہ مجنون کا نہیں تو کس کا کام ہو سکتا تھا؟ لیکن جنون تھا دعوت حق کا جس پر ہزاروں خردمندیاں صدقے تھیں،

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

حقیقت ناآشنا اسے ساحر کیوں نہ سمجھتے۔ اس ماحول میں بھی لوگ اس کی دعوت قبول کر لیتے تھے ــــ اور ناقابل برداشت مظالم کے باوجود اس دعوت سے کنارہ کش نہ ہوتے تھے ان میں آزاد بھی تھے غلام بھی تھے، اور لونڈیاں تک تھیں بلاشبہ یہ سحر تھا، مگر حق کا سحر، وہ کاہن بھی تھا، وہ جو پیغام سناتا اس میں غیبی باتیں بھی ہوتیں۔ لیکن دراصل وہ باتیں کہانت نہ تھیں۔ خدا کی نازل کی ہوئی وحی تھیں لیکن رسالت کے منکر ان باتوں کو کہانت نہ کہتے تو پھر خدا کے رسول کو رسول ماننا پڑتا اور اس کے لئے ان کا نفس راضی نہ تھا۔

جب وہ آزمائش کی تمام بھٹیوں سے تپ کر کھرا سونا ہو کر نکل گیا تو پھر ایک اسکیم بنائی گئی۔ شہر کے تمام باشندے مل کر اس کو تلوار کے گھاٹ اتار دیں کہ اس کا خاندان آہ کر کے رہ جائے۔ مگر... انتقام لینے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ اگر خدا خود اپنے رسول کا محافظ نہ ہوتا تو یہ اسکیم بر روئے کار آچکی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں برہنہ شمشیروں کے ساتھ مکان کا محاصرہ کرنے والوں کے درمیان سے بچ کر نکل گیا۔ خدا کا ہاتھ اس کے سر پر سایہ فگن تھا۔ کوئی دشمن آنکھ اسے دیکھ نہ سکی۔ ہر آنکھ پر اونگھ طاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے صدیق، اپنے سچے دوست کے ساتھ ترک وطن کا مسئلہ طے کر چکا تھا۔ وہ اس کے مکان پر پہونچا۔ وہاں ساری تیاریاں مکمل تھیں، سفر کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ مکان خالی پاکر دشمن تلاش میں نکلتے، اس لئے تین روز تک شہر سے دور ایک پہاڑی غار میں قیام کرنا طے ہوا۔ اس زندگی کا یہ کتنا خطرناک مرحلہ تھا۔ یہ مرحلہ اسوقت اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا جب دشمن اسے تلاش کرتے ہوئے غار سے اتنے قریب ہو گئے کہ غار میں ان کے پاؤں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ دوست کو خدا کے رسول سے بے پایاں محبت تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب دشمنوں سے خدا کے رسول کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ خدا کے رسول نے دوست کو تسلی دی کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے

دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است

دشمن غار کا جائزہ لینے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔ دیکھ رہے ہو اس زندگی کے واقعات و حوادث کو، یہ زندگی عجیب بھی ہے اور غیر عجیب بھی، عجیب یوں کہ پورے ملک و ماحول میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے ملک و ماحول نہیں پوری دنیا میں، تاریخ انسانی سے پوچھو کوئی زندگی ایسی ہے؟ اور غیر عجیب یوں کہ

اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو توجیہہ سے باہر ہو۔ اس دور ابتلا و آزمائش میں اس زندگی کا امتیاز کیا ہے جس کی مثال نہیں؟ جس میں کوئی عجوبہ پن نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کیسا عجوبہ پن ہے کہ وہ بے یار و مددگار ہے بے بس و بے کس ہے؟ اس کے ساتھی اور یہ خود بھی ہدف ظلم و ستم ہیں اور اپنی حفاظت سے معذور۔ اس بے کسی و بے بسی کے عالم میں بھی اس کا حال کیا رہا؟ وہ جھٹلایا گیا۔ اسے برا بھلا کہا گیا۔ اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اس کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ چھتوں سے اس کے اوپر کوڑے پھینکے گئے نماز پڑھتے ہوئے اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اسے پہاڑ کی گھاٹی میں تین برس تک محبوس و محصور رکھا گیا اس کو قتل کرنے کے لئے اسکیم بنائی گئی۔ اور مکان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس سچائی کے لئے جس کا وہ داعی تھا۔ اور اس فرض کی ادائیگی کے لئے جس پر وہ مامور کیا گیا تھا۔ اس کی زندگی دنیا کو بتاتی ہے کہ دنیا کی ہر تکالیف و مصیبت کو برداشت کیا جا سکتا ہے اور دنیا کی عزیز سے عزیز شئے چھوڑ دی جا سکتی ہے۔ لیکن سچائی کو چھوڑا نہیں جا سکتا، ہر طرح کے خطرات کے باوجود فرض سے دست کشی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ہمیں کتنی زندگیاں ایسی ملتی ہیں؟ ان کی مثالیں ملتی ہیں تو صرف خدا کے رسولوں کی زندگیوں میں یا ان زندگیوں میں جن کی خدا کے رسول تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔

سیرت نگار ہمیں صرف اس کی بے کسی و بے بسی اور مظلومیت کی روداد بتاتے ہیں لیکن اس زندگی کی ان عظمتوں کی نشاندہی نہیں کرتے کہ اس مظلومیت و بے کسی کے عالم میں بھی اس کی دعوت کے تیور کتنے تیکھے تھے۔ وہ کس بے خوفی اور بے باکی سے اپنا پیغام سناتا تھا اور شہر کے رؤسا اور اکابر کو کس طرح جھنجھوڑتا تھا۔ اس کی نشاندہی خدا کی وہ کتاب کرتی ہے جو اس پر نازل ہو رہی تھی۔ اس کا انداز دیکھو اور اس کی برق آسانی کا اندازہ کرو۔

"اگر تم کو اس (کلام) میں کچھ شک ہو، جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ۔ اور خدا کے سوا تمہارے جو مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو، اگر تم سچے ہو، لیکن اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے . . . . تو اس آگ سے ڈرو

جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

(بقرہ ، رکوع ۳)

"(مخالفین دعوت!) کیا تمہارے کفار (تاریخ کے گذشتہ مخالفین دعوت سے) بہتر ہیں؟ یا تمہارے لئے (خدائی) صحیفوں میں چھٹکارا کی کوئی دستاویز موجود ہے؟ کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں؟ عنقریب (ان کے) جتھے کو ہزیمت ہوگی اور وہ پشت پھیر کر بھاگینگے"

"ہمیں اس (ناشکرے) سے سمجھ لینے دو، جسے ہم نے اکیلا پیدا کیا ہے۔ اور بکثرت مال دیا ہے اور (ہر وقت) حاضر رہنے والے بیٹے۔ اور ہر طرح کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ پھر بھی وہ طمع رکھتا ہے۔ کہ ہم اسے اور زیادہ دیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ ہمارے آیتوں کا معاند ہے ہم اسے بلندی پر چڑھائیں گے۔ اس نے سوچا اور (دشمنی کا طریقہ) تجویز کیا۔ وہ مارا جائے اس نے کیسا (برا طریقہ) تجویز کیا۔ پھر مارا جائے اس نے کیسا طریقہ تجویز کیا، پھر تامل کیا پھر تیوری چڑھائی، اور منھ بگاڑ لیا۔ پھر پیٹھ پھیر لیا اور (قبول حق میں) استکبار سے کام لیا۔ پھر کہا یہ (خدائی کلام نہیں) جادو ہے۔ جو اگلوں سے منتقل ہوتا آیا ہے۔ (اور کہا) یہ (خدا کا) نہیں بلکہ انسان کا کلام ہے۔ ہم عنقریب اس کو دوزخ میں ڈال دیں گے۔" (مدثر)

"کیا تم نے اس (دشمن حق) کو دیکھا۔ اگر اس نے (حق کو) جھٹلایا اور اس سے روگردانی کی ـــ کیا اس کو معلوم نہیں خدا دیکھ رہا ہے۔ سن رکھو اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹینگے۔ اس جھوٹے خطاکار کی پیشانی کے بال۔" (علق)

یہ ڈانٹ پھٹکار اور زجر و توبیخ انہیں سرداران قوم کے لئے ہے۔ جو خدا کے رسول کو بے یار و مددگار سمجھ کر ستایا کرتے تھے اور مستقبل میں اس زجر و توبیخ کا حرف حرف پورا ہو کر رہا۔

یہ ابتلاء و آزمائش کی زندگی تھی، مظلومیت اور بے کسی کی زندگی، جلنے اور تپنے کی زندگی، تیرہ برس کے طویل امتحان کی زندگی، تپ تپ کر نکھرنے اور چمکنے کی زندگی۔ اگر کوئی اوپر کے اقتباسات

پر غور کرے تو اسے مخالفت، بغض وعناد، ظلم وستم اور جبر وتشدد کی گھنگھور گھٹاؤں میں آپ کی محسن و مظلوم زندگی خود ایک برق بن کر کوندتی نظر آتی ہے جو عنقریب ظالم مخالفین پر گرنے والی ہے۔

یہ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ کی زندگی تھی۔ جس کا ہر آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر تھا۔ یہ غریب الوطنی کی زندگی فتح وکامرانی کی زندگی تھی۔ اگر وطن کا ہر گھر مظالم وشدائد کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا تھا تو غریب الوطنی کے ہر در و دیوار نے اخلاص و عقیدت اور رضاکاری و جاں نثاری کے جذبات کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

اس نئے وطن میں پہونچ کر یکایک غنچہ گل ہزارہ بن گیا۔ گل نے گلشن کی صورت اختیار کر لی چشمہ سیلاب میں منتقل ہو گیا، ہوا کا ہلکا ہلکا جھونکا طوفان بن گیا۔ چند شاخوں کا تنا ایک تناور درخت بن گیا جس میں شاخیں ہی شاخیں پھوٹ پڑیں۔ اور ہر شاخ پھولوں اور پھلوں سے لد گئی، یوں نہیں بلکہ ایسا سمجھئے کہ آپ آفتاب کو تو روز طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے پورا ماحول تاریک ہوتا ہے پھر افقِ شرق پر سرخی نمودار ہوتی ہے۔ پھر ایک سنہری تھال کی صورت میں آفتاب برآمد ہوتا ہے اس کے طلوع سے پہلے ہی رات پر جگمگانے والے ستارے جھلملا کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ مہتاب کا چہرہ بھی فق ہو جاتا ہے۔ آفتاب برابر بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تمازت وحرارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ بلند ہوتے ہوتے نصف النہار پر پہونچ جاتا ہے۔

یہ زندگی بھی ایک کھلا ہوا پھول، ایک چمن، ایک تناور درخت، ایک شاخسار، ایک سیلاب، ایک طوفان اور ایک بلندی پر چمکنے والا آفتاب بن گئی۔ اب یہ زندگی ایک زندگی نہیں رہ جاتی تمام خوش رنگ اور خوشبودار پھول، رنگینیاں اور عطر بیزیاں اس ایک پھول میں جمع ہو جاتی ہیں۔ تمام روشن اور چمکدار چیزوں کی ضیائیں اور تجلیاں اسی ایک آفتاب میں مرکوز ہو جاتی ہیں وہ ایک زندگی بیک وقت نوحؑ کی زندگی بن جاتی ہے، ابراہیمؑ کی زندگی بن جاتی ہے یوسفؑ کی زندگی بن جاتی ہے۔ موسیٰؑ کی زندگی بن جاتی ہے داؤدؑ وسلیمانؑ اور عیسیٰؑ کی زندگی بن جاتی ہے ...... اور دنیا کے تمام خدا پرستوں سچائی کے علمبرداروں اور نیکی کے معلموں کی پاکیزہ زندگیوں کے محاسن وکمالات کا مجموعہ اور نمائندہ بن جاتی ہے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

یہ زندگی ـــــ

ایک پیغمبر کی زندگی ہے۔

ایک داعیِ حق کی زندگی ہے۔

ایک معلمِ اخلاق کی زندگی ہے۔

ایک بانیِ سیاست کی زندگی ہے۔

ایک معمارِ معاشرہ کی زندگی ہے۔

ایک مقنن کی زندگی ہے۔

ایک دستور ساز کی زندگی ہے۔

ایک حکمراں کی زندگی ہے۔

ایک سپہ سالار کی زندگی ہے۔

ایک جج کی زندگی ہے۔

ایک متاہل اور خانہ دار کی زندگی ہے۔

ایک زاہد اور عابدِ شب زندہ دار کی زندگی ہے۔

ایک صاحبِ مال و منال فیاض و سخی کی زندگی ہے۔

ایک فاقہ کش اور تنگ حال کی زندگی ہے۔

وہ نئے وطن میں پہونچکر ایک ریاست کی بنا ڈال دیتا ہے اور امن و امان کے تحفظ و بقا کے لئے مقامی دوسرے عناصر و قبائل سے معاہدے کرتا ہے۔

وہ ایک نئے نقشے پر نئے معاشرے کی تاسیس کرتا ہے۔

وہ اس ریاست اور معاشرے کے لئے دستور اور قوانین کی تشکیل کرتا ہے۔

وہ اس ریاست اور معاشرے کا رئیس ہے۔

وہ ریاست اور معاشرے کو احکام و قوانین دیتا ہے۔

وہ ریاست اور معاشرہ سے متعلق مسائل و معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔

وہ معاشرے کو عبادت و خدا پرستی کی علمی و عملی درس دیتا ہے اور نماز میں اس کی امامت کرتا ہے۔

وہ مسجد کی تعمیر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتا ہے۔

وہ مسجد میں بیٹھ کر داعیوں کی جماعت ترتیب دیتا ہے اور انہیں اطراف و جوانب میں بھیجتا ہے

وہ مسجد سے اٹھ کر گھر میں جاتا ہے تو گھر گرہستی کے کاموں میں اپنے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں بادشاہ بھی ہے اور فقیر بے نوا بھی۔ اس کے جسم پر نہایت کپڑے کم ہی ہوتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جسم پر جو کپڑے ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں ہوتا کہ وہ جسم کے کپڑے بدل لے۔ وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتا ہے۔ وہ معمولی چپل پہنتا ہے۔ اور ٹوٹ جاتی ہے تو اپنے ہاتھ سے اسے گانٹھتا ہے۔ اس کے گھر میں مہینوں چولہا نہیں جلتا فاقوں اور نیم فاقوں پر گذر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے "الفقر فخری" یہ فقیرانہ زندگی ہی میرے لئے فخر و امتیاز کا باعث ہے لیکن وہ دوسروں کو محنت و مشقت اور حصولِ معاش کی تلقین و تاکید کرتا ہے۔ اسے سوال و گداگری سے شدید نفرت ہے وہ اس کی سخت مذمت کرتا ہے۔ کہتا ہے نیچے کے ہاتھ سے اوپر کا ہاتھ بہتر ہے، وہ اپنے مہمانوں کی خدمت خود کرتا ہے غلاموں کو اپنے ساتھ کھلاتا ہے ان کی روکھی سوکھی دعوت قبول کرکے بھی ان کی دل جوئی کرتا ہے۔ وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا کھانا بھوکوں کو کھلا دیتا ہے اور گھر بھر بھوکے رہ جاتے ہیں۔ یہ ہے اس کی زندگی۔ وہ تمام دن لوگوں کی تعلیم و ہدایت میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، لوگوں کے مقدمات کے فیصلے میں، لوگوں کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح میں، داعیوں کے بھیجنے میں، فوجی دستوں کی روانگی میں، نماز کی امامت میں کرنے میں اور ان کے علاوہ دوسرے کاموں کی انجام دہی میں گذارتا ہے۔ اور رات کو کھڑے ہو کر اتنی لمبی لمبی نماز پڑھتا ہے کہ اس کے پاؤں ورم کر آتے ہیں خدا کے سامنے اس طرح تضرع اور زاری کی حالت میں اس کے سینے سے ایسی آواز نکلتی ہے گویا چولھے پر چڑھی ہوئی دیگ جوش مار رہی ہے۔ لیکن اس شب بیداری میں وہ اپنی ازواج کے حقوق کو نظر انداز نہیں کرتا،

اور نہ کسی کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم پر خدا کا بھی حق ہے تمہارے نفس کا بھی اور تمہارے گھر والوں کا بھی۔ وہ ایک معتدل زندگی کا علمبردار ہے۔ دنیا کہتی ہے قعرِ دریا میں تختہ بند ہو کر تر دامنی سے بچنا محال ہے۔ دنیادار خداپرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے پہاڑوں، غاروں، جنگلوں، خانقاہوں اور مٹھوں کی زندگی ضروری ہے۔ اس کے نزدیک کمال اس میں ہے کہ انسان قعرِ دریا میں تختہ بند ہو مگر تر دامن نہ ہو۔ دنیا میں رہ کر بھی دنیا کی نجاستوں سے محفوظ رہے۔ دنیا میں رہے مگر دنیا کا پجاری نہ بن جائے۔ دنیا کو برتے مگر آخرت کے پیش نظر۔

تو یہ ہے اہل و عیال کی خدمت کرنے والی زندگی، فاقوں میں بسر ہونے والی زندگی، اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑوں اور چپلوں کی مرمت کرنے والی زندگی۔ غلاموں کے ساتھ کھانا کھلانے والی زندگی راتوں کو نماز و دعا اور خدا کے حضور رونے گڑگڑانے والی،

پھر یہی وہ زندگی ہے کہ جب دشمن کی موج طوفان بن کر اٹھتی ہے کہ اس نے سچائی کی جو شمع روشن کی ہے اسے گل کر دے تو وہ دفعتاً ایک قائد اور سپہ سالار کی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا ذکر و فکر، توبہ و انابت، عبادت و دعا کا وعظ دفعتاً ایک پُرجلال جنگی خطبہ میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ اپنے پیروؤں کے سینوں میں وہ آگ بھڑکا دیتا ہے کہ وہ اہل و عیال اور اپنے جسم و جان سے بے نیاز سربکف نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اچھے اسلحے نہیں ہیں۔ پوری سواریاں نہیں ہیں، رسد نہیں ہے، تعداد کم ہے دشمن کہیں زیادہ تعداد میں ہے۔ اور ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ، مگر حق کا ایک نشہ ہے قربانی کا ایک ولولہ ہے۔ اطاعت و پیروی کا ایک جذبہ ہے۔ جوان کو میدان جنگ میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے قائد کا بھروسہ اپنی تعداد پر نہیں ہے اسلحہ پر نہیں ہے، ساز و سامان پر نہیں ہے، خدا پر ہے، خدا کی نصرت پر ہے اس کی کارسازی پر ہے۔ یہ خدا کا رسول، خدا کا بندہ، خدا کی مرضی کی تکمیل کا مشن لے کر اٹھنے والا دیکھتا ہے کہ اس کے پیرو مٹھی بھر ہیں۔ دشمن کا ایک عظیم لشکر ہے۔ وہ بے اختیار خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑتا ہے والہانہ انداز میں کہتا ہے اے خدا! یہ مٹھی بھر تیرے نام لینے والے آج مٹ گئے تو پھر رہتی دنیا تک تیرے پرستار پیدا نہ ہوں گے اور تو کبھی پوجا نہ جائے گا۔ خدا اپنے رسول کی پکار سنتا ہے اس کی الحاح و زاری پر

اس کا دریائے نصرت جوش زن ہوجاتا ہے۔ بشارت دی جاتی ہے سیھزم الجمع ویولون الدبر، اے میرے رسول غم نہ کرو، اس دشمن حق گروہ کو ابھی ہزیمت ہوگی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔

خدا کا رسول اپنی مٹھی بھر فوج کو دشمن کی فوج عظیم سے ٹکرا دیتا ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا ہے قلیل التعداد فوج کثیر التعداد پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔

ایک میدان میں نہیں، ایک بار نہیں، مختلف میدانوں میں، مختلف برسوں میں بار بار اس زمین و آسمان نے اس زمین پر بسنے والوں نے، اپنی دائی کی بکریاں چرانے والے، غار کے گوشہ نشین، اور شہر کے مظلوم و ستم رسیدہ کو جو تین سال تک پہاڑی گھاٹی میں محصور رہا۔ قائد و سپہ سالار کی حیثیت میں دیکھا اور اس حالت میں دیکھا، جب وہ یک و تنہا دشمنوں میں گھر گیا تھا۔ اور جب اس کی ذات تیروں کا ہدف تھی۔ جب اس کے رخسار میں مغفر کی کڑیاں چبھ گئی تھیں جب اس کے دندان مبارک ٹوٹ گئے تھے جب اس کی شہادت کا غل مچ گیا تھا۔

غرض اس نے جنگ کے فراز کو بھی دیکھا اور اس کے نشیب سے بھی دوچار رہا۔ مگر ہر معرکہ اور ہر نشیب اور ہر فراز میں وہ ایک مثالی قائد ثابت ہوا۔ اور نتیجے کے اعتبار سے کامیاب، وہ زندگی کے ہر شعبہ کا عالم تھا اور ہر شعبے کے ہر پہلو کا۔ اس کی زندگی ہر پہلو سے مکمل اور نمونہ تھی۔

تو یہ تھا اس زندگی کا سپاہیانہ اور قائدانہ پہلو، لیکن بہر حال یہ زندگی خدا کے رسول کی زندگی تھی۔ ایک طرف جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا دوسری طرف موقع ملتے ہی یہی سپاہیانہ زندگی داعی عالم کی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔ قیصر و کسریٰ اور وقت کے دوسرے شاہان و سلاطین کے نام دعوت اسلام کے مکتوب لکھے جانے لگتے ہیں۔ اور دنیا دیکھتی ہے کہ اس کے داعی اور سفراء قیصر کے دربار میں، کسریٰ کے دربار میں، مقوقس شاہ مصر کے دربار میں، نجاشی شاہ حبشہ کے دربار میں اور کتنے ہی دوسرے درباروں میں مکتوب رسالت پیش کر رہے ہیں۔ مکتوب کا مضمون اتنا واضح، اتنا صاف اور اتنا پر جلال ہے کہ جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کی عظمتیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ خدا کے رسولوں کے سوا کبھی کسی نے وقت کے کسی بادشاہ کو اس طرح مخاطب نہیں کیا۔ سلاطین عالم کو اس طرح مخاطب کرنے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی۔ یہ اس لئے کہ اب تک داعی عالم بن کر

کوئی آیا ہی نہیں تھا۔

یہ تھی اس زندگی کی عظمت! پھر دنیا نے دیکھا کہ اس داعی حق نے پروانۂ حال مکتوب نے قتل کا اقدام لینے کے لئے آپ اپنے ہاتھوں سے لوٹ جانا ہی ہے جس وقت پر مستاور دعا گو و مددگار قیصر روم سے [illegible] اور اس کی سلطنت دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار ہوتی ہے

یہ پیغمبرانہ زندگی ہے جس کا مقصد جدال و قتال سے دور معرکہ و خونریزی نہیں قیام عدل تھا۔ جو پیغمبر ساری دنیا اور تمام انسانیت کا ہادی و رہنما تھا اس نے مقصد رسالت سے قریب رہتے ہوئے بہت دور کی چیز بھی دو اسی تمام کی دعوت کے ساتھ مبعوث ہوا تھا۔ وہ انسانیت کا علم بردار تھا لیکن عالمی امن اور امن و امان کے قیام کے لئے کبھی جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اس کی جنگ کا یہی مقصد تھا

اس نے جب تلوار اٹھائی فتنہ و فساد ظلم و بے انصافی اور بدامنی و بربریت کو مٹانے کے لئے۔ اس نے اپنے قدیم وطنی دشمنوں سے ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدہ صلح کر لیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں مگر اس کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے۔ اور انہوں نے اس معاہدے کی دھجیاں اڑا دیں ان کی شرارت و دشمنی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ خدا کے پیغمبر کو فیصلہ کرنا پڑا کہ حق و انصاف اور امن و امان کا قیام اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمیشہ کے لئے ان کا زور توڑ دیا جائے اور ان کی قوت ختم کر دی جائے۔

خدا کے رسول نے فوج آراستہ کی اور اس وطن کی جانب کوچ کر دیا جس کو اس نے اپنے قتل کی رات میں صرف ایک رفیق کی معیت میں چھوڑا تھا۔ آج اس کی رکاب میں دس ہزار بہادروں کی فوج تھی جو بارہا دشمنوں کو شکست دے چکے تھے۔ دشمنوں کو دفاع و مزاحمت کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ فاتحانہ شہر میں داخل ہو گیا اس فاتحانہ زندگی کی بے مثالی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ اس کو اپنی فتح کا کوئی غرور ہے نہ کوئی کبر و غرور وہ اونٹ پر سوار ہی سوار خدا کے حضور جھک جاتا ہے۔ اتنا جھک جاتا ہے کہ اس کی پیشانی اونٹ کی کوہان سے جا لگتی ہے۔ اس کا پاکیزہ قلب خدا کی حمد و ستائش اور جذبۂ تشکر سے لبریز ہے۔

مفتوحین حاضر ہوتے ہیں فاتح ان کو مخاطب کر کے فتح کا خطبہ دیتا ہے لیکن اس خطبے میں اپنی بڑائی اور

شان و دولت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور نہ ہی نصرت کا، شجاعت و بہادری کا۔ پورا خطبہ خدا کی حمد و ثنا، اس کی عظمت و کبریائی، اس کی نصرت و کارسازی کی شکر گزاری اور انسانی تعلیم و ہدایت پر مشتمل ہے جیسا فاتح بے مثال ہے ویسا ہی خطبہ بھی بے مثال ہے۔ ایسا خطبہ کبھی کسی فاتح نے نہ دیا تھا۔ بالکل رسالت و نبوت کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔

خطبہ فتح کے بعد مفتوحین کا نمبر ہے۔ یہ وہ مفتوحین ہیں جنہوں نے بیس برس تک فاتح پر بے پناہ اور لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے۔ قتل کے منصوبے بنائے تھے۔ شہر سے خفیہ طور پر نکل جانے کے باوجود گرفتاری کا انعام اعلان جاری کیا تھا۔ مدینہ پر بار بار جارحانہ فوجی حملے کئے تھے۔ ایسے مفتوحین نے قتل عام کے سوا کس اور فیصلہ کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ لیکن یہ فاتح مجسم رحم و کرم اور حلم و عفو ہے۔ اس کا ایک امتیازی لقب ہے "رحمۃ للعالمین" ——— وہ اپنے بیس برس کے جانی دشمنوں سے ایک مختصر اور سادہ سوال کرتا ہے "آج تم مجھ سے کس بات کی توقع رکھتے ہو؟" یہ مفتوحین اسی فاتح کی قوم ہی کے لوگ ہیں جنہوں نے فاتح کا بچپن دیکھا ہے جوانی دیکھی ہے، اخلاق و کردار دیکھے ہیں۔ انہیں نے تو صادق اور امین کا خطاب دیا تھا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ شخص کبھی جھوٹا نہیں ہوا۔ اس کا دعوائے رسالت و نبوت بھی جھوٹا نہیں تھا۔ اس کی رسالت و نبوت کی زندگی بھی ان کے لئے ایک کھلی کتاب تھی۔ انہوں نے اس کے پیغمبرانہ سیرت و کردار کو بھی دیکھا، پرکھا، آزمایا، وہ اپنے معیار سے کبھی نیچے نہیں اترا۔ ان کا انکار و اختلاف ضد و سرکشی کا انکار و اختلاف تھا۔ لیکن اب ضد و سرکشی اور انکار کا وقت نہ تھا۔ اعتراف و اقرار کا وقت تھا مفتوحین جواب دیتے ہیں

"ہم آپ کے متعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے ہیں کہ آپ ایک صاحب لطف و کرم بھائی اور صاحب لطف و کرم بھائی کے بیٹے ہیں۔"

یہ مفتوحین کی جانب سے کسی مداہنت اور چاپلوسی کا مظاہرہ نہ تھا۔ ایک حقیقت اور سچائی کا اعتراف تھا فاتح دراصل اپنی فطرت ہی سے صاحب خلق عظیم اور سراپا لطف و کرم ہے اور آج اس کا دریائے عفو و درگزر خصوصیت کے ساتھ جوش پر ہے۔ زبان رحمت ترجمان نے اعلان کیا "آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

مفتوحین آزاد ہوگئے۔ یہ کتنی عجیب فاتحانہ زندگی ہے اور کتنی بلند! ہمیں اس شان کی کسی دوسری فاتحانہ زندگی کا علم نہیں ہے۔ یہ فتح ایک شہر اور ایک قوم کی فتح نہ تھی۔ یہ ملک کا مرکزی شہر تھا اور مفتوحین کو ملک میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی فتح و شکست پر ملک کی فتح و شکست کا دار و مدار تھا۔ اس قوم کی فتح نے ملک کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔ اطراف ملک سے گروہ در گروہ آکر حلقۂ اسلام و اطاعت میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔

آؤ۔ اس زندگی کا ایک منظر اور دیکھو۔ ایسا منظر جسے دنیا نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ دیکھو پہاڑوں کے دامن میں آباد اس آسمان کے نیچے اور اس زمین پر خدا کی سب سے مقدس عبادت گاہ، خدائی توحید کی دعوت کا سب سے بڑا مرکز۔ اس سے متصل چھوٹا سا شہر اور اس کے باہر وسیع میدان۔ یہی وہ شہر ہے جس سے اس مقدس زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اسی شہر نے اس کو عین عالم شباب میں "امین" اور "صادق" کا خطاب دیا تھا۔ اسی سامنے کے پہاڑ میں وہ غار ہے جہاں پہلی بار خدا کا مقدس فرشتہ اس کے پاس آیا تھا اور خدا کی طرف سے اس کو منصب رسالت کا پیغام دیا تھا۔ یہی وہ شہر ہے جس نے خدا کے اس سچے رسول کی رسالت کو جھٹلایا تھا ورنہ وہ تو اب تک بھی ان کے نزدیک امین اور صادق ہی تھا۔ اس کے پاس وہی جھٹلانے والے اپنی امانتیں رکھتے تھے کیونکہ اپنی بستی بھر میں اس سے زیادہ کوئی امانتدار اور سچا نہ تھا۔ یہی وہ شہر ہے جس کی گلیوں میں اس کے لئے کانٹے بچھائے جاتے تھے اور چھتوں سے اس کے سر پر کوڑے پھینکے جاتے تھے۔

وہ دیکھو سامنے وہ پہاڑ ہے جس پر کھڑے ہو کر اس نے سرداران شہر کو پکارا اور جمع کیا تھا۔ اور ان کو خدا سے ڈرایا تھا اور جواب میں بدکلامیاں سنی تھیں۔ دیکھو وہ پہاڑ جس کے غار میں اس نے اپنے ایک رفیق کے ساتھ ترک وطن کرتے ہوئے تین راتیں چھپ کر گذاری تھیں۔ کہ اس کی جان کے دشمن اسے گرفتار نہ کرلیں جن کے آدمی اسی غرض سے چھوٹے ہوئے تھے۔ لیکن آج اس شہر کا کیا حال ہے؟ آج بھی شہر وہی ہے لیکن اس کے بدنصیب دشمن آج دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اپنے انجام کو پہونچ چکے ہیں جو باقی ہیں اور بڑی تعداد میں باقی ہیں ان میں اب اس کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی جھٹلانے والا نہیں ہے۔ کوئی راہ میں کانٹے بچھانے والا نہیں ہے۔ کوئی اس کے سر پر کوڑا پھینکنے والا نہیں ہے۔ کوئی اس مقدس عبادت گاہ میں اس پر ظلم و ستم ڈھانے والا نہیں ہے وہ اب ان بتوں سے بھی پاک ہو چکی ہے جن کا اس پر ناجائز تسلط تھا۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

سب اس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب اس کے جاں نثار ہیں۔ سب اس کے عقیدت کیش ہیں۔ سب اس کی راہ میں آنکھیں بچھانے والے ہیں۔ سب اس پر عقیدت و محبت کے پھول برسانے والے ہیں۔ اب یہ عبادت گاہ بھی اس کا حقیقی متولی وہی ہے۔ اس کا حقیقی کلید بردار وہی ہے۔ جو کبھی کلید بردار تھا وہ اس کا غلام بنے در پے اس کا کرم یافتہ۔ اور ہاں اس میدان کو دیکھو جو بہت دور تک گھرا ہوا ہے اس میں جس طرف نظر اٹھاؤ انسان ہی انسان ہیں۔ جو ملک کے گوشے گوشے سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ گویا انسانوں کا جنگل سا بن گیا ہے۔ بہت زیادہ کا نہیں صرف دس برس پہلے کا نقشہ سامنے لاؤ، تم نے اسی شہر اور اس کے نواح میں اس زندگی کا ایک نقشہ دیکھا تھا۔ اور آج کیا عالم ہے۔ اس زمین پر اس سرزمین پر یہاں کوئی خدائے واحد کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ خدا کی اپنی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ اس سرزمین پر نہیں، پورے ملک پر۔ ملک کے تمام باشندے اس خدائی سلطنت کی رعایا بن چکے ہیں۔ جن کی قسمت میں یہ سعادت نہیں ہے وہ بھی باج گزار ہیں۔ یہ جو تمام ملک سے کھنچ کھنچ کر آنے والے یہاں جمع ہیں سب اس خدائی سلطنت کی وفادار رعایا ہیں۔ اور نائب سلطنت کون ہے وہی فقیری میں سلطانی کرنے والا۔ اپنی اسی کٹیا میں رہنے والا جو اس شہر کو چھوڑ کر جانے کے بعد مدینے میں اس کے لئے بنی تھی اور رات کو کملی اور چٹائی کے بستر پر سونے والا، اندھیری کٹیا میں جس میں چراغ نہ جلتا تھا۔ یہ جو تم جمع دیکھ رہے ہو بصد شوق انسان ہی انسان۔ یہ خدا کے اپنی دربار میں حاضری دینے آئے ہیں اور یہ نائب السلطنت؟ یہ بھی، وہ خدا کی رعایا میں خدا کا سب سے بڑا وفادار، سب سے بڑا فرماں بردار، خدا کا سب سے بڑا بندگی گزار ہے۔ کیوں نہیں، خدا کا نائب السلطنت جو ہے۔ لیکن ذرا اس کی شان دیکھو، تم جن چہروں کو دیکھ سکتے ہو ان کو صرف ایک چہرے کی طرف متوجہ دیکھو گے۔ تم جتنی آنکھوں کو دیکھ سکتے ہو صرف انھیں آنکھوں کا نگران پاؤ گے۔ تم جتنے کانوں کو دیکھ سکتے ہو سب اسی طرف لگے ہوں گے۔ یہ کیا جذب ہے، کیسی کشش ہے، کیسا ذوق ہے، کیسا شوق ہے، کیسی محبت ہے، کیسی عقیدت ہے، کیسی محویت ہے، اور کیسی وارفتگی ہے۔ آخر یہ لوگ دیکھ کیا رہے ہیں؟ کیا اس میدان میں زریں خیمے نصب ہو گئے ہیں؟ کیا یہاں مرصع تخت زرنگار رکھا گیا ہے؟ کیا لوگ زریں قباؤں والے حشم و خدم کی زینت و آرائش کا چکا چوند پیدا کرنے والا منظر دیکھ رہے ہیں؟ کیا تک رہے ہیں قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت کو بھی ہیچ کر دینے والی نائب السلطنت کی شوکت شاہانہ کو؟ نہیں،

ایسی کسی چیز کو نہیں، خدا کی سلطنت تو ان سب چیزوں کو مٹانے کے لئے وجود میں آتی اور برپا ہوتی ہے چنانچہ یہاں ایسی کسی چیز کا تصور بھی موجود نہیں، قیصر و کسریٰ کا دربار منعقد ہوتا ہے تو اس میں قیصر و کسریٰ کی مدح و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ خدائی سلطنت کا دربار ہے، یہاں خدا کی حمد و ثنا سے دربار گونج رہا ہے۔ سنو —

"اے خدا ہم حاضر ہیں، اے خدا (تیری سلطنت میں) کوئی تیرا شریک نہیں ہے شکر اور نعمت اور سلطنت سب کچھ تیرے ہی لئے ہے۔ (تیری سلطنت میں) تیرا کوئی شریک نہیں۔"

آگے بڑھو، دیکھو نائب السلطنت اب اس پہاڑ... پر کھڑا ہے۔ جہاں سے ...... کبھی اس نے اہل شہر کو خدا کی وحدانیت کا پیغام دیا تھا۔ سنو آج وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، سلطنت اسی کے لئے ہے اور حمد بھی اسی کے لئے، وہی زندگی اور موت دیتا ہے، وہ ہر شے پر قادر ہے اس ایک کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اسی ایک نے تمام گروہوں کو شکست دے دی۔"

دنیا نے اب تک یہ نہ جانا تھا کہ اس زمین پر بھی خدا کی سلطنت قائم ہوتی ہے لیکن اب دنیا اسی زمین پر بچشم سر خدائی حکومت دیکھ رہی ہے۔ اور اس سمجھ میں نہ آنے والی حقیقت کو بغیر کسی فکر و کاوش کے سمجھ رہی ہے کیونکہ اب وہ ایک واقعہ ہے اب چلو اس میدان میں جہاں خدا کی سلطنت کا نائب اپنی اونٹنی کی پشت سے خدا کی رعایا کو خطاب کر رہا ہے۔ کیا تم نے کبھی ایسا منظر دیکھا تھا؟ تو سنو —

"لوگو! خبردار! تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ (آدم) بھی ایک ہی ہے۔ خبردار! نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ سرخ کو سیاہ پر، نہ سیاہ کو سرخ پر، ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو پرہیزگاری کی بنا پر۔"

سنا تم نے خدائی سلطنت کے نائب کے خطاب کو، یہ ساری کائنات خدا کی ہے ساری کائنات

کی طرح دنیا بھی خدا کی ہے اور اس کی سلطنت کا ایک حصہ، اس کا سلطان بھی وہی ہے، اور یہ انسان؟ اس میں کوئی بھی بادشاہ فرمانروا اور سلطان نہیں، تمام انسان ایک باپ کی اولاد ہیں اس لئے ان میں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا، سب یکساں خدائی سلطنت کی رعایا ہیں۔ یہاں امتیاز اور بڑائی اسی کے لئے ہے جو خدا کا سب سے زیادہ وفادار، سب سے زیادہ فرمانبردار اور سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا اور اس کے ضابطہ و احکام کی پابندی میں ممتاز اور فائق ہے۔ کیوں؟ یہ خدائی سلطنت جو ہے۔

نائب السلطنت کے کچھ احکام سنو۔

"تمہارے غلام، تمہارے غلام!! (دیکھو) ان کا ہمیشہ خیال رکھنا) جو تم کھانا وہی ان کو کھلانا، اور جو تم پہننا وہی ان کو پہنانا"

"عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرنا"

خدائی سلطنت میں سب سے زیادہ فکر کمزوروں کی رکھی جاتی ہے۔ خدائی سلطنت ہے۔ یہاں نہ طبقہ وارانہ کشمکش ہے اور نہ مطلق العنان سرمایہ داری، خدائی سلطنت کا مزاج فطری ہوتا ہے سماج کی فطرت جو کچھ چاہتی ہے وہ سب یہاں موجود ہے۔ مگر کوئی عنصر کسی کا حریف نہیں۔ باہم سب حلیف ہیں۔ مگر پستوں کو ابھارا ضرور جاتا ہے۔ کہ وہ بلند ہوں اور بلندوں کو اعتدال پر لایا جاتا ہے اس طرح کہ غلام آقاؤں کے صف میں پہونچ جاتے ہیں۔ لیکن بغیر اس جبر کے کہ بلندوں کی گردن دبا دی جائے۔ اور ان کی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے اور سنو۔

"جاہلیت (قبل از عہد رسالت) کے تمام خون (کے قضیے) باطل قرار دیئے گئے، اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان) ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل قرار دیتا ہوں"

"جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کے سود یعنی عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں"

"خبردار! مجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار ہے، خبردار! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں۔ اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار ہے"

سنا: خدا کا نائب جو حکم دوسروں کو دیتا ہے سب سے پہلے اس پر عمل کرتا ہے یہاں دوسرے قانون سازوں کا سا معاملہ نہیں ہے جو اپنے کو قانون سے بالاتر سمجھ کر اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کو پاؤں تلے روندا کرتے ہیں۔ خدا کا نائب السلطنت جہاں بھی ہے خدا کا نائب السلطنت ہے وہ جہاں بھی ہے خدا کی سلطانی کا اعلان و اقرار ہے ــــ وہ اس دربار سے فارغ ہو کر اپنے نئے شہر کو دور ہی سے دیکھ کر جوش تشکر میں اعلان کرتا ہے:-

سب سے بڑا خدا ہے، اس ایک کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اسی کی سلطنت ہے اسی کے لیے ستائش ہے، اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ لوٹ آ رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے فرمانبردارانہ، سجدہ کرتے ہوئے، اپنے رب کی حمد میں مصروف۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور تمام گروہوں کو شکست دی۔

نہ کہیں اپنی تعریف، نہ اپنی کامیابی کا کوئی ذکر، نہ اپنے رفیقوں اور اپنے فوج و سپاہ کی داد و داد، جو بھی شکر و ستائش ہے خدا کی ہے، جو کچھ ذکر ہے اور جہاں بھی ذکر ہے خدا کی نصرت و یاوری کا، اس کی سلطنت اور اس کے اقتدار کا۔ اس کی یکتائی اور بے ہمتائی کا، یہ نمونہ ہے خدا کی نیابت و خلافت کی زندگی کا۔

اب یہ زندگی اپنی منتہائے معراج پر تھی۔ یہی زندگی پیغمبر کی بھی زندگی تھی، فاتح کی زندگی بھی تھی، بادشاہ اور فرمانروا کی زندگی بھی، سارا ملک زیر نگیں تھا لیکن بادشاہی اور حکومت و فرمانروائی کی یہ زندگی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ نہ شاہی تخت تعمیر ہوا، نہ تاج بنا، نہ قبائے شاہی، نہ دربار آراستہ ہوا، نہ حشم و خدم کی تشکیل ہوئی، نہ چوبدار قائم ہوئے، نہ قلعہ تعمیر ہوا، اور نہ حرم شاہی، اس مسجد میں جس میں نماز ہوتی تھی چٹائی پر دربار بھی لگتا تھا۔ عدالت بھی قائم ہوتی تھی، داعیوں اور فوجوں کی روانگی بھی عمل میں آتی تھی، یہی مسجد مسجد بھی تھی اور دارالحکومت بھی، مسجد بھی کس شان کی۔ فرش مٹی کا تھا، اور چھت کھجور کے پتوں کی، جو بارش میں اتنی ٹپکتی کہ فرش کیچڑ ہو جاتا۔ ملک کے فاتح اور حکمران کا ایوان شاہی؟ وہ بھی اسی مسجد کا نمونہ تھا۔ جن کے دروازوں میں کواڑ کی جگہ کمبل کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور رات کو چراغ نہ جلتا تھا۔ حکمراں کے گھر پر اب بھی فاقے ہوتے تھے۔ بچھونا اب بھی معمولی ٹاٹ کا بنا تھا یا کمبل کا تھا اور تکیہ چمڑے کا کھجور کے

پتوں سے بھرا ہوا، جسم کے کپڑے اور پاؤں کے چپل بھی وہی پیوند لگے ہوئے، ملک میں انقلاب ہوگیا لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب ہوگیا۔ افلاس و ناداری خوش حالی سے بدل گئی۔ لیکن اس زندگی میں کوئی انقلاب نہ ہوا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب ہر طرف سے مال و دولت کی راہیں کشادہ ہوگئیں۔ ڈھیر کا ڈھیر مال آتا، مسجد میں ڈال دیا جاتا۔ خدا کے رسول سارے کا سارا مال لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ اور خود دامن جھاڑ کر اٹھ جاتے۔ گھر میں جاتے تو معلوم ہوتا آج فاقہ ہے۔

یہ تھی بادشاہی اور حکومت کی زندگی۔ کیا کبھی دنیا میں کوئی ایسا بادشاہ بھی گذرا؟۔

اس زندگی کے آخری نقشے پر بھی ایک نظر ڈال لو۔

معلوم رہے یہ اللہ کے رسول کی زندگی ہے اللہ کے رسول کو اللہ کی عبادت و بندگی سے زیادہ کون سی چیز محبوب ہوسکتی ہے؟ وہ بیماری ہے جس میں اللہ کے رسول کا انتقال ہوتا ہے جب تک مسجد میں پہونچنے کی طاقت ہے نماز مسجد ہی میں پڑھی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں بھی مسجد نہیں چھوٹتی کہ دو آدمی کندھا تھام کر مسجد میں لاتے ہیں اسی درمیان میں ایک روز مسجد میں لوگوں سے کہا جاتا ہے،

"خدا نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ چاہے وہ دنیا کی نعمتوں کو لے لے یا خدا کے پاس جو کچھ ہے اسے قبول کرے اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں"۔

یہ خدا کا بندہ کون تھا؟ یہی خدا کا رسول۔

اور سنو ۔ "حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے۔ اور وہی چیز حرام کی ہے۔ جو خدا نے حرام کی ہے"۔

سنا۔ یہ ہے زندگی اللہ کے رسول اور اللہ کے نائب السلطنت کی۔ خدا کے رسول اور اس کے نائب کا کام اپنا حکم چلانا نہیں۔ اللہ کے احکام و قوانین کا اجراء و نفاذ ہوتا ہے۔ یہی فرق ہے دوسرے لیڈروں، حکمرانوں اور اللہ کے رسول اور نائب میں۔ اور یہ فرق مشرق و مغرب اور آسمان و زمین سے بھی زیادہ ہے۔

آہ! اب مسجد میں جانے کی سکت نہیں ہے۔ مگر دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے فجر کی نماز کا وقت ہے حجرے کے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا جاتا ہے خدا کے بندے خدا کی عبادت میں مشغول ہیں۔ بھول سا چہرا کھلایا ہوا ہے پھر بھی اس خوشی سے کھل جاتا ہے کہ خدا کی اطاعت و بندگی کا جو پودا لگایا تھا وہ پھول پھل رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے آہٹ پاکر سمجھتے ہیں خدا کے رسول آج مسجد میں آرہے ہیں۔

آہ! ان کے دلوں کی کیفیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے رسول کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اور جو اللہ کے رسول کو اپنی ہر متاع عزیز سے عزیز تر سمجھتے تھے۔ باپ ماں بیٹے اور اپنی جان ہر چیز سے زیادہ عزیز، اس خیال سے ان کو اتنی خوشی ہے کہ وہ مانے سے باہر ہو جائیں۔ لیکن آہ مسجد میں آنے کی طاقت کہاں؟ پردہ گر گیا۔ سب کو تو ایک جھلک دیکھنے کا بھی موقع نصیب نہ ہوا جن کی ایک نگاہ پڑ گئی۔ سنو وہ کیا کہتے ہیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوا جیسے مصحف کا کوئی ورق ہے۔ آہ! نقاہت سے بالکل سفید ہو گیا ہے۔

اس مقدس زندگی کا یہ آخری دن تھا خدا کا رسول خدا کے پاس چلا گیا۔ اپنا کام انجام دے کر، اپنے مشن کو پورا کر کے، کامیاب و بامراد، ایک خدائی سلطنت قائم کر کے۔ ایک قوم کھڑی کر کے۔ جو خدا کے سوا کسی کی محکوم نہ تھی جو خدا کے سوا کسی کی پجاری نہ تھی۔ جو خدا کے احکام و قوانین کے سوا کسی کے احکام و قوانین کے تابع

نہ تھی جس کی پوری زندگی خدا کی اطاعت و بندگی کی زندگی تھی۔ جو خود بھی خدائی دستور اور ضابطے کی پابند تھی۔ اور جس کی زندگی اسی دستور و ضابطے کے اجراء و نفاذ اور نشر و اشاعت کیلئے وقف تھی، جو خدائی سلطنت کا علم لیکر اٹھی اور قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے۔

جیسی یہ حکومت بے مثل ہے ویسی ہی رعایا بھی بے مثل ہے اگر تاریخ میں اس حکومت کی نظیر نہیں ملتی تو اس رعایا کی بھی کوئی نظیر نہیں۔ یہاں کسی دباؤ اور جبر سے اطاعت و فرمانبرداری نہیں ہوتی اطاعت و فرمانبرداری، قلب کے عمق کی عقیدت و محبت سے، اس ایمان و یقین کے ساتھ کہ اسی اطاعت و فرمانبرداری پر دنیا اور آخرت کی فلاح و سعادت کا مدار ہے۔

پہلے ایک نگاہ حکمراں کی شان پر ڈالو پھر رعایا کا انداز اطاعت دیکھو۔ فرمانروا اپنے دربار میں اس طرح بیٹھتا ہے کہ کوئی اجنبی شخص اس کے دربار کو دیکھ کر سمجھ نہیں سکتا کہ یہاں فرمانروا کون ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ چلتا ہے تو اسی شان کے ساتھ کہ اس حالت میں بھی اجنبی اس کو پہچان نہیں سکتا۔ وہ کہیں کسی مجلس میں جاتا ہے

تو جہاں جگہ پاتا ہے وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ سفر میں ہوتا ہے۔ یا پڑاؤ پر آپس میں کام تقسیم کئے جاتے ہیں تو ایک کام خود بھی اپنے ذمے لیتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ اس کا کام خود انجام دے دیں مگر وہ اپنے لئے یہ امتیاز پسند نہیں کرتا۔ اگر سواری میں کوئی اس کا شریک ہوتا ہے اور باری باری سوار اور پیدل چلنا پڑتا ہے تو وہ اپنی باری میں پیدل چلتا ہے اپنے شریک کے اصرار پر بھی اس کی باری میں سواری پر نہیں چلتا۔

اس کے باوجود رعایا کا یہ حال ہے کہ وہ جس کو پکارتا ہے چاہے وہ کسی حالت میں ہو لبیک یا رسول اللہؐ کہتا ہوا دوڑ پڑتا ہے۔ ایسا نہ کرنے میں وہ انتہائی معصیت سمجھتا ہے وہ تقریر کرتا ہے تو لوگ سراپا سماعت بن جاتے ہیں سکوت و محویت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے سروں پر پرندے آکر بیٹھ جائیں تو ان کو احساس نہ ہو۔ اگر وہ حاضرین کو خطاب کرتا ہے کہ جو جہاں ہو وہیں بیٹھ جائے اور ایک شخص راستے میں اس حکم کو سن لیتا ہے تو تعمیل کیلئے وہیں راستے میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اس کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں لیکن ان کو یہ گوارا نہیں کہ ان کے آقا کے تلوے میں کانٹا بھی چبھے۔ اگر کبھی جنگ میں زخمی ہو جاتا ہے تو وہ زخم سے بہتے ہوئے خون کو دوڑ کر چوس لیتے ہیں۔ کہ زمین پر گرنے سے خون کی بے حرمتی نہ ہو۔ اس کے وضو کا پانی لوگوں کے لئے تبرک ہوتا ہے۔ وہ اس کے تھوک کو بھی تبرک سمجھ کر اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں۔ اس کی ایک ایک نقل و حرکت کی پیروی کو اپنے لئے باعث فلاح و سعادت سمجھتے ہیں۔

ایسی رعایا دنیا کے کس بادشاہ اور فرمانروا کو نصیب ہوئی۔ یہ رعایا کہیں باہر سے اتنی تربیت یافتہ اور عقیدت کیش نہیں آگئی تھی، یہ زندگی کی تعلیم و تربیت اور سیرت و کردار کا فیضان تھی۔

اس ایک زندگی نے پورے ملک کی زندگی بدل دی۔ اور صدیوں کے پرانے جمے ہوئے سانچے کو توڑ کر بالکل نئی زندگی کے سانچے میں ڈھال دیا اور ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ پیدا کر دیا جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ خدا پرستی و آخرت پسندی۔ تقویٰ و پرہیزگاری، عدل و انصاف، مہر و محبت، اخوت و مساوات، ایثار و اخلاص، ہمدردی و غم خواری اس معاشرہ کی سیرت و کردار کے چند عنوانات ہیں۔

اس زندگی نے ہزاروں مثالی زندگیاں پیدا کر دیں۔ جو انسانیت کے چہرے کا غازہ اور اس کے تاج افتخار ہیں۔ ایک چراغ نے ہزاروں چراغ روشن کر دیئے۔ جس سے انسانیت کی پیشانی جگمگا اٹھی، ایک آفتاب نے

ہزاروں ستارے بکھیر دیئے جن سے زمین رشک آسماں بن گئی۔

یہ ایسے زمانے اور ایسے ملک میں ہوا جب اصلاح و ترقی اور تہذیب و تمدن کے یہ وسائل جو آج موجود ہیں ناپید تھے۔ اور ایسی قوم میں ہوا جو وقت کے وسائل ترقی اور لوازم تہذیب و تمدن سے بھی محروم تھی۔ پھر اتنا عظیم الشان فاقد النظیر انقلاب کیسے ہوا یہ اسی زندگی کا اعجاز تھا۔

مکہ میں کیا تھا، وہاں کے لوگ کیسے تھے، کس اخلاق و مزاج کے تھے، ان کی سیرتیں کیسی تھیں، ان کی تہذیب و تمدن کا کیا حال تھا، وہ اونٹوں کے چرانے اور بھیڑ بکریوں کی گلہ بانی کرنے کے سوا اور کیا جانتے تھے، بس ایک تجارت اور اس کی آمدنی اڑاتے تھے۔ جوئے شراب اور عیش پرستی میں غرق تھے ان میں نوشت و خواند تک کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ وہ حکومت و فرمانروائی سے کیا واسطہ رکھتے تھے۔ اور نظم و سیاست کو کیا جانتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کشت و خون اور قتل و غارت کے سوا کسی غیر قوم سے کب معرکہ آرائی کی تھی۔

لیکن اس زندگی نے جو زندگیاں پیدا کیں ان پر ایک نظر ڈالو دیکھو گے کہ انھیں شاہان کشور کشا بھی ہیں جو قیصر و کسریٰ کی فوجوں کے مقابلے کے لئے فوجیں بھیج رہے ہیں۔ ان میں وہ سپہ سالار بھی ہیں جو قیصر و کسریٰ کے سپہ سالاروں کو شکست دے رہے ہیں۔ ان میں وہ فوجیں بھی ہیں جو قلیل التعداد ہونے کے باوجود قیصر و کسریٰ کے بڑے بڑے کثیر التعداد لشکروں سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ان کے سر میدان میں سوکھی کھیتی کی طرح کاٹ رہی ہیں۔ ان میں وہ فاتح بھی ہیں جو شام، ایران اور مصر کو فتح کر رہے ہیں ان پر اپنا علم نصب کر رہے ہیں ان میں وہ خلفاء بھی ہیں جو دنیا کے ان وسیع ممالک پر اس حسن و خوبی سے فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اور اس کمال دانش سے ان کا نظم و نسق چلا رہے ہیں۔ جن کو دیکھ کر دنیا دنگ ہے۔ ان میں خطیب ہیں، شاعر ہیں سیاست داں ہیں، ماہر قانون ہیں۔ جج ہیں مصلح اخلاق ہیں۔ ناشر علم ہیں۔ غرض وہ سب ہیں جو ایک اعلیٰ ترقی یافتہ اور مہذب ملک و حکومت کے لئے ضروری کہے جا سکتے ہیں۔ اور اس پائے کے ہیں کہ مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ کون مقدس و مبارک زندگی ہے جس کی نسبت بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ؎

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمن ساختہ اند

میں سمجھتا ہوں اس زندگی کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا جانتی ہے کیونکہ یہ زندگی ایک سے زیادہ نہیں کہ نام بتائے بغیر اشتباہ کا امکان ہو۔ یہ ایسی معروف، ممتاز اور چھائی ہوئی زندگی ہے کہ جو اس زندگی سے سرسری طور پر بھی متعارف ہے وہ صاحب زندگی کے نام نامی و اسم گرامی سے بخوبی واقف ہے، یہ زندگی ہے جامع عالم، ہادی اعظم، خاتم الانبیاء، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضور کی مقدس اور باکمال و بےمثال زندگی سے جو مثالی زندگیاں پیدا ہوئیں ان میں حضرت ابوبکر صدیق ہیں، حضرت عمر فاروق ہیں، حضرت عثمان غنی ذی النورین ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں، حضرت عبیدہ بن الجراح ہیں۔ فاتح شام، حضرت سعد بن ابی وقاص ہیں فاتح ایران، حضرت عمرو بن العاص ہیں فاتح مصر، حضرت معاذ بن جبل ہیں ممتاز سپہ سالار، حضرت بلال و حضرت سلمان ہیں، جو غلامی کی زندگیاں گزار چکے تھے۔ وہ جن میں کے ایک کو حضرت فاروق اعظم تک سیدنا بلال کے پر احترام نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور حضرت سلمان مدائن کے گورنر ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن عباس

ہیں، حضرت عبداللہ ابن عمر ہیں، حضرت عبداللہ ابن زبیر ہیں، حضرت زید بن ثابت ہیں، حضرت ابوذر ہیں، حضرت ابو ہریرہ ہیں ان میں کوئی علم وفضل کا تاجدار ہے کوئی زہد وورع کا، کوئی اور کسی کمال کا مالک ہے، اور سب اپنی اپنی جگہ منتخب روزگار ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔

چراغ جب تک جلتا رہتا ہے اس کی روشنی بھی باقی رہتی ہے۔ چراغ کے گل ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس کی روشنی کی جھلک تک باقی نہیں رہتی۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے نصف النہار پر پہونچتا ہے۔ زوال پذیر ہونا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ غروب ہوجاتا ہے۔ شفق کچھ دیر تک اس کے غم میں خونبار رہتی ہے۔ پھر وہ بھی دم توڑ دیتی ہے۔ اس ابدی اور لافانی زندگی کو دیکھو، یہ چراغ گل ہوکر بھی گل نہ ہوا۔ یہ آفتاب غروب ہوکر بھی غروب نہ ہوا۔ یہ چراغ آج بھی روشن ہے۔ یہ آفتاب آج بھی ضیا پاشی کررہا ہے۔ اس "سراج منیر" سے آج بھی بصیرتیں روشن اور قلوب مجلّی ہیں۔ کون ہے ایسی لازوال اور باقی زندگی؟ سوچو یہ زندگی کتنی عجیب، کتنی حیرت زا، اور کیسی دائم وقائم ہے؟ اور کیسی یکتا و یگانہ؟ ایسا کون ہوگا جو زندگی کی عظمت کو سمجھتا ہوگا اور پھر اس زندگی کے احترام میں اس کے سامنے سرعقیدت خم نہ کردے گا؟ اگر تم زندگی کی عظمت کو سمجھتے ہو تو تم خود بتاؤ، سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، حق وانصاف کے نام پر بتاؤ، تم اس کو کیا کہوگے۔ جس کا دل اس زندگی کے جذبۂ احترام وعقیدت سے خالی ہو؟ کیا تمہارے نزدیک ایسا انسان بھی حق پسند اور حق نگر انسان کہلانے کے قابل ہے؟

اس مقدس ومحترم زندگی پر اتنے لوگوں نے لکھا ہے، اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی، — معتقدین نے بھی اور مخالفین نے بھی، جن کا صحیح شمار نہیں۔ اور سب نے اپنے اپنے اسلوب اور انداز میں۔ اپنے اپنے مزاج ومذاق کے مطابق لکھا ہے۔ مگر اس بے مثال اور عظیم زندگی کے محاسن وکمالات نہ ختم ہوئے نہ ہوں گے ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

ہماری درسیات

یہ کتابیں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیحد مقبول ہو کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل رہی ہیں آپ بھی انھیں ملاحظہ فرما کر اپنے بچوں کیلئے فرمائش روانہ فرمائیں۔ تاجر صاحبان کو سو روپے سے کم کی کتابوں پر ۲۵/ ورنہ ۳۳⅓ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ اس رعایت سے جلد فائدہ اٹھائیں۔

اردو :۔ آسان ریاضی اول ۲۰ نئے پیسے دوم اخلاقی کہانیاں دوم ۶/

منی کتاب ۴/ سوم ۸۰ نئے پیسے دوم (۱۱/) سوم ۸۰ نئے پیسے چہارم ۵/

ہماری کتاب قاعدہ نسخ ۴/ **جنرل سائنس :۔** چہارم (۹۰ نئے پیسے) پنجم ۶/ ۱۲/

ہماری کتاب قاعدہ نستعلیق ۴/ عام معلومات اول ۴/ دوم ۶/ **ہندی :۔**

ہماری کتاب اوّل ۳۰ نئے پیسے سوم (۸۰ نئے پیسے) چہارم (۱۰/) ہماری پوتھی پرائمر ۶/

دوم (۶۲ نئے پیسے) سوم ۱۲/ **جغرافیہ :۔** پہلا بھاگ ۶/، دوسرا بھاگ ۱۰/، تیسرا بھاگ ۱۲/

چہارم (۸۰ نئے پیسے) پنجم ۱۲/ ہماری دنیا اول ۴۰ نئے پیسے اسلام پربودھنی ۱۲/، دو روپے

ششم (۱۲/) دوم (۸۰ نئے پیسے) سوم ۱۲/ شانتی مارگ ۵/

بچوں کی کتاب قاعدہ، پہلی ۶/ **تاریخ :۔** آئینۂ تاریخ اول ۸۰ نئے پیسے پیارے رسول ہندی ۶/

پیاری نظمیں اول ۴/، دوم ۴/ **سیرت :۔** جگت گرو ۱۰/

ہمارے نغمے اول ۶/، دوم ۶/ پیارے رسول ۵/ **معلوماتی :۔**

کہانیاں :۔ ہادیِ اعظم اول (۷۳ نئے پیسے) دوم ۸/ موٹر ۵/

آسان کہانیاں ۳/ سراپائے رسول ۱۴/ ریل ۵/

اخلاقی کہانیاں اوّل ۲۰ نئے پیسے **حساب :** بچوں کا حساب ۴/ ذہنی تربیت ۱۲/

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

اتباع سنت کی حقیقت وہمہ گیری

مولانا ابوبکر اصلاحی

سنت کیا ہے؟ سنت وہ طریقہ ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کرکے اپنے مالک کو خوش کیا انسانوں کی اصلاح کی اور لوگوں پر حق کی شہادت قائم کی، اسی سنت کو اختیار کرنے کا مطالبہ اس حدیث میں کیا گیا ہے جس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کیا جارہا ہے

"میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور سننے اور حکم بجالانے کی، اگرچہ کوئی حبشی غلام ہی ہو، کیونکہ میرے بعد تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بہت زبردست اختلاف دیکھے گا سو تمہارے لئے میری اور خلفائے راشدین کی سنت اختیار کرنا ضروری ہے (دیکھو) اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا اور دانتوں سے کس لینا۔" (ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

یہ مطالبہ فرداً فرداً ہر مسلم سے اور بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ سے کیا گیا ہے اور اسے ترک کرنے والوں کو منکرات کا مرتکب ٹھہرایا گیا ہے اور ان سے جہاد کو ایمان کی علامت قرار دی گئی ہے اور اس کے لئے کیا خوب بلیغ انداز اختیار فرمایا، گویا ہمارے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے۔

"اللہ نے مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی بھیجا اس کی امت میں اس کے مددگار اور ساتھی تھے جو اس کی سنت کو اختیار کئے ہوئے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے پھر ان کے بعد ناخلف پیدا ہوئے جن کا قول عمل کے خلاف تھا اور عمل حکم کے خلاف، سو جس نے ان سے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے لیکن اس سے نیچے ایمان کا کوئی ذرہ نہیں۔" (مسلم)

سنت کو زندہ کرنے والے ساتھ ہی ساتھ سنت کو زندہ کرنے والوں کے کام کی فضیلت بھی واضح کردی کہ جتنے لوگ اس کی وجہ سے سنت کو اختیار کریں گے ان تمام کے اجر کے برابر اس کو اجر ملے گا اور ان

(اختیار کرنے والوں) کے اجر میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ جس طرح کسی نے برے کام کی بنا ڈالی تو اسے ان تمام لوگوں کے عمل سے جنھوں نے اس کو اختیار کیا اسے عذاب سے حصہ ملے گا۔ فرمایا!

"جس نے کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد ختم کر دی گئی تھی تو اس پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر اس کو اجر ملے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی اور جس نے کسی بُرے رواج کی بنا رکھی جس سے نہ اللہ خوش ہوگا نہ رسول تو اس پر تمام چلنے والوں کے برابر اسے بدلہ (عذاب) ملے گا اور اس پر چلنے والوں کی سزاؤں میں سے کچھ کمی بھی نہ ہوگی" (ترمذی، ابن ماجہ)

اور جس وقت کہ انتشار ہو، اور سنت سے عام طور پر بے توجہی برتی جا رہی ہو، سنت پر دنیا کے حقیر فائدے کو ترجیح دی جا رہی ہو ایسے کٹھن وقت میں سنت کے اختیار کرنے والے کا مقام کیا ہوگا اور اسے کتنا اجر ملے گا۔ مندرجہ ذیل حدیث سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔

جس نے میری امت میں بگاڑ کے وقت میری سنت اختیار کی اسے سو شہیدوں کا اجر ملیگا" (بیہقی)

اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول کے اصلی مقام کو وہ حدیث پوری طرح واضح کر رہی ہے جسے امام مالک نے مؤطا میں بیان فرمایا ہے کہ

"میں تم میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت چھوڑے جا رہا ہوں اگر ان دونوں کو اختیار کئے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے"

جب سنت رسول کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے اختیار کرنے پر خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا زور دیا ہے اسے زندہ کرنے والے کو عظیم الشان اجر کی خوش خبری دی گئی ہے اور اس کے ترک کو گمراہی قرار دیا گیا ہے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ سنت کی پوری تشریح سامنے رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ لاعلمی سے اسے ترک کرکے موردِ عتاب ٹھہریں اور دنیا و آخرت کی رسوائی ہمارے حصہ میں آئے۔

اتباعِ سنت آپ اس دنیا میں اس وقت تشریف لائے جب دنیا کے لوگ اپنے مقصدِ وجود کو فراموش کر چکے تھے آپ کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ آپ انسان کو اس کے اصلی مقام سے باخبر کر دیں اور بحیثیت ایک فردِ انسانی کے خود انسانیت کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں، چنانچہ اس ذمہ داری کو آپ نے

با حسن وجوہ انجام دیا جس کی شہادت خود لوگوں نے دی جبکہ حجۃ الوداع میں خطبہ دیتے وقت آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ "کیا میں نے فریضۂ رسالت کا حق (بذریعہ قول وعمل) ادا کیا؟" لوگوں نے جواب دیا ہاں آپ نے ادا فرمایا تو آپ نے فرمایا "اے اللہ تو بھی گواہ رہنا"۔

پس چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق بسر کی اس لئے آپ کی مکمل پیروی کر کے ہی انسان اپنے مقصد وجود کو پورا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ پیروی کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ کسی حصۂ زندگی میں آپ کی پیروی کی جائے البقیہ کو آزاد کر لیا جائے، یہ اتباع سنت نہیں ہے بلکہ ہر شعبہ زندگی میں آپ کے قدم بقدم چلنا اتباع سنت ہے اور پوری زندگی کو آپ کی اطاعت میں دیدینا مطلوب و مقصود، یہی وجہ ہے کہ آپ کی اطاعت —— مکمل اور ہر شعبۂ زندگی میں اطاعت —— خدا سے محبت کی دلیل اور خدا کی پسندیدہ اور اس کی مغفرت کیلئے شرط قرار دی گئی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	کہہ دو (اے پیغمبر) کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ	میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران ۳۱)	گناہوں کو معاف کر دیگا اور اللہ بڑا مغفرت کرنیوالا اور مہربان ہے۔

اور کیا اب بھی کوئی شک وتذبذب باقی رہ جاتا ہے کہ زمان ومکان کی قید سے ورے —— کہ ان سے تو صرف اشکال ومظاہر بدلے ہوئے نظر آتے ہیں بنیادی حقائق میں کوئی تبدیلی نظر نہیں ہوتی —— ہمیں ہر آن ہر زمان اور ہر مکان میں اسوہ —— پوری زندگی کے لئے اسوہ —— اسی ذات بابرکات کو بنانا چاہیئے جن کے متعلق خود خالق کون ومکان کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب) تم لوگوں کیلئے رسول اللہ کی زندگی میں ایک عمدہ نمونہ ہے۔

البتہ ہماری نظر آپ کی زندگی کے تمام حصوں پر ہونی چاہیئے اور اس سلسلے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ آپ قرآن کے مکمل نمونہ تھے جیسا کہ حضرت عائشہ نے سائل کے جواب میں کہا تھا کہ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ یعنی جو کچھ قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے آپ اس کے عملی نمونہ تھے اس لئے اگر آپ کو قرآن کا

زندہ نمونہ یا قرآن کی چلتی پھرتی تصویر کہی جائے تو بے جا نہ ہوگا

اتباع سنت کی ہمہ گیری | قرآن پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی اور اس کے مختلف حصوں کے لئے ضابطہ دیا گیا ہے اور آپ کی زندگی شاہد ہے کہ آپ نے اس کو عملی جامہ پہنایا، اب اگر ہم آپ کی پوری زندگی اور اس طریقے کا جسے آپ نے ہر شعبہ زندگی میں اختیار فرمایا جائزہ لیں تو اسے ہم مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، معیشت سیاست، اور ان سبھی میں ہم آپ کی پیروی کر کے امانت سنت کے امین بن سکتے ہیں مگر حالات کچھ اور ہے

دین سے مسلمانوں کی غفلت و بے پرواہی نے انھیں عبادات سے بہت دور کر دیا ہے۔ بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو اس کی پابندی رکھتے ہوں، لیکن پھر بھی اگر کوئی چیز ایسی ہے جس میں مسلمان سنت کی پیروی کا خیال رکھتے ہیں اور جانچتے ہیں کہ کیا سنت ہے اور کیا خلاف سنت، تاکہ اسی کے مطابق رویہ اختیار کریں۔ تو وہ عبادات ہی ہیں، باقی رہے معاملات و اخلاق اور معاشرت و معیشت تو ان میں مسلمانوں کو بہت کم اس کی توفیق ہوتی ہے کہ حلال و حرام، جائز و ناجائز، سنت و خلاف سنت کا فرق کریں اور اس میں ناخواندہ سے لے کر پڑھے لکھے تک سب برابر ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

رہی سیاست تو اس میں مسلمان اغیار کے کھینچے ہوئے خطوط میں کوئی ترمیم کر ہی نہیں سکتے، وہی بولیاں بولتے ہیں جو اغیار سے سن رکھی ہیں اور اسی طرز سے سوچتے ہیں جس کی طرح اوروں نے ڈال دی ہے۔ قرآن و سنت میں بھی ہمارے لئے رہنمائی ہے؟ تو یہ بات نہ تو کبھی ان کے ذہن میں آتی ہے اور نہ ہی کبھی اس پہلو کو سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ چلتے ہوئے مختلف راستے ہیں جن میں سے اپنی پسند سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے ہیں اور اسی کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں چنانچہ قرآن سے اس کی حقانیت پر دلائل فراہم کرنا انھیں کا کام ہے حالانکہ مسلم کے پاس قرآن ایک ایسی کسوٹی ہے جسے لے کر ہر کھرے اور کھوٹے، ہر صحیح و غلط اور ہر اسلامی و غیر اسلامی شئے کو پرکھ سکتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کا ہم سے مطالبہ صرف اسی قدر ہے کہ محض عبادات ادا کر لئے جائیں اور بس؟ تو پھر قرآن میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے لئے قوانین کیوں بیان ہوتے؟

اور پھر کیا رسول کی زندگی صرف عبادات ہی تک محدود تھی اور عبادات ہی میں تمسک بالسنۃ کا حکم ہے؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں وہیں سے ہدایت لینی چاہیئے اور یہی مطلب ہے اتباع سنت کا!

باطل کے زیر سایہ یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز جتنی ہی زیادہ اہم ہے ہم اس سے اسی قدر غفلت برت رہے ہیں: اگر اس وقت حدود و قصاص شریعت متروک ہو گئے ہیں تو پھر اتباع سنت کا کیا مطلب؟ کیا ہم وہ قوت حاصل کریں جس سے ان کا اجرا ممکن ہو؟ یا اس باطل کو اور مضبوط کریں جس سے ہمیں یہ دن دیکھنے پڑے ہیں؟ اور معاملہ صرف حدود و قصاص اور قضا و تعزیرات ہی کا نہیں بلکہ دشواریاں ان میں بھی ہیں جنھیں آپ غلط فہمی سے اغیار کی دسترس سے باہر سمجھتے ہیں۔ اگر کسی آبادی کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو اس میں طرح طرح کی گندگیاں پھیلائیں جن سے ساری فضا وبائی جراثیم سے بھر جائے تو کیا ہم لوگوں کو چند احتیاطی تدابیر بتلا کر انھیں وبائی امراض میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ اور کیا مرض سے محفوظ رہنے کا صرف وعظ مفید ہو سکتا ہے؟ بس اگر اس کے لئے اس بات کی ضرورت بشدت محسوس کرتے ہیں کہ جب تک گندگی پسند حضرات کے ہاتھوں سے آبادی کا نظم و نسق صفائی پسند لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل نہ ہو جائے اور مکمل طریقے سے آبادی کی صفائی نہ کی جائے اس وقت تک وبا سے لوگوں کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔

ٹھیک اسی طرح آج جبکہ باطل کا دور دورہ ہے۔ اس نے ہر جگہ اپنے انڈے بچے پھیلا رکھے ہیں۔ زنا اور شراب کے لائسنس دیئے جا رہے ہیں، تھیٹر اور سینما کا رواج عام ہے، عریاں تصاویر اور فحش لٹریچر کی اشاعت پر کوئی روک ٹوک نہیں، جس سے ہمارا نوجوان طبقہ پوری طرح متاثر ہو رہا ہے، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باطل کی پیدا کردہ اس ناپاک فضا میں سنت ـــــــ محدود معنی ہی میں سہی ـــــــ پر عمل کئے بغیر صرف نصیحت کافی ہے اور لوگ منتظر بیٹھے ہیں کہ آپ کا وعظ سنیں اور عمل کے لئے تیار ہو جائیں، اگر ایسا ہی ہوتا تو نماز و روزے پر بہت سی تقریریں ہوتی ہیں، زکوٰۃ و حج پر بہت سے خطبے دیئے جاتے ہیں، لیکن آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہوتا ہے کہ:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف ۱۷۹)	ان کے دل ہیں جن سے سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں، کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ، یہ لوگ سخت غافل ہیں۔"

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ گھروں سے لے کر بازاروں تک اور مدرسوں و کالجوں ـــــ جنھیں درحقیقت صحیح تربیت گاہ ہونا چاہیئے ـــــ سے لے کر شہروں تک باطل نے پوری فضا مسموم کر دی ہے اس زہر آلود فضا میں جبکہ معیارِ خیر و شر ہی بدل گیا ہے، برائیاں آسان ہوگئی ہیں اور نیکی کی راہ اختیار کرنا پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ایسی صورت میں صرف نصیحتوں اور وعظوں سے یہ سمجھنا کہ سنت رسول کا حق ادا ہو گیا فریبِ نفس ہے۔

سنت رسول کا محدود تصور سامنے رکھ کر عشرت گاہوں اور خلوت کدوں کو بہت زیادہ زینت دی جا چکی ہے اگر اب اتباع رسول کا حق ادا کرنا ہے تو اس کے پورے مفہوم کو سامنے رکھ کر گھروں اور حجروں کو چھوڑنا ہوگا۔ اور اس پوری فضا کو بدلنا ہوگا، باطل کے ایک ایک نقش کو مٹانا ہوگا، خدا پرستی کی بنیادوں پر معاشرے اور اسٹیٹ کی بنیادوں کو استوار کرنا ہوگا۔ تب کہیں جاکر برائیاں مٹیں گی اور نیکیوں کا رواج عام ہوگا۔ تب لوگ آپ کا وعظ سنیں گے اور اس کا اثر بھی ہوگا اور تب آپ ہوں گے متبع سنت اور عامل شریعت ورنہ وہی

"بدنام کنندہ نکو نامے چند"

خطاب بدرگاہ رسالت مآب ؐ

پروفیسر علی الطنطاوی
مترجم ناظم میواتی

اے اللہ کے رسول ؐ اور اے ہمارے سرکار! کتنی دور ہیں ہم آپ سے!!! ہمارے سینے میں دل بھی ہے اور ضرور ہے لیکن ——— لیکن حُبِّ رسول سے خالی ہے اور حُبِّ دنیا سے معمور۔ آہ! یہ سخت ہو گیا ہے۔ اور اتنا سخت ہو گیا ہے کہ ہم اسے دل بھی کہنا نہیں چاہتے، اس لئے کہ وعظ و پند اور نصیحتوں کا تو اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ کاش! ہم اسے پتھر ہی کہہ سکتے! ——— ہمارے چہرے پر آنکھیں بھی ہیں اور ضرور ہیں لیکن ——— لیکن آہ! یہ محرمات کی نظر بازی کے جادو سے مسحور ہو کر جامد اور خشک ہو چکی ہیں۔ حیف اور صد حیف کہ خشیت الٰہی اور خوف خدا کے ہیبت اور جاں گداز مناظر کے تصور کے سامنے بھی ان کی پلکیں نم نہیں ہوتیں!! اور ہمارے پاس نفس بھی ہے اور ضرور ہے لیکن ——— لیکن آہ! یہ پاپ سے بوجھل ہو گیا ہے اور اتنا بوجھل ہو گیا ہے کہ اپنے ہی بارگراں کے باعث حق و صداقت کے جادہ مستقیم پر گامزن ہونے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔

اے اللہ کے رسول اور ہمارے سرکار! آپ خورشید ہدایت ہیں مگر آپ کی حدت جمال ہم تک پہونچے تو کیسے؟ ہم گناہوں کے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں، ہم آپ کے دربار میں حاضر ہوں تو کس طرح؟ ہم اپنی خطاؤں کے سبب پابہ زنجیر ہیں اور ہم آپ کے آستانہ مقدس تک رسائی پائیں تو کیونکر؟ غلط کاریوں کے بارگراں کے باعث ہمارے پاؤں اٹھنے کی تاب سے بھی محروم ہیں آہ! ہم پیکر معاصی ہیں اور ضعف روحانیت کے مریض ـــ اور سچ پوچھیے تو یہی ہمارا وہ مرض ہے جسے ہم آپ کی خدمت اقدس میں علاج کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے ہمیں تعلیم دی اس لئے ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم جیسے بشر ہی ہیں لیکن آپ کو تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے وحی و کمال جیسے ممتاز شرف سے سرفراز فرما کر وہ عظمت بخش دی ہے جو کسی کو بھی نصیب نہیں

ہو سکتی۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مرضی کے بغیر آپ کسی کو بھی چراغ ہدایت نہیں دکھاتے اور یہ امر آپ کے بس کا روگ بھی نہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ نے عقیدۂ توحید پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ صرف اللہ ہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ اس کے سوا کسی سے بھی نہ تو کچھ سوال کیا جا سکتا ہے اور نہ استعانت ـــــــ پھر اس صورت میں آپ ہی بتائیے کہ آخر ہم کریں تو کیا؟ ہمارا مرض بہت دردناک اور مہلک ہے ـــــــ یہ دیکھئے یہ ہے ہمارا خون دل۔

اے اللہ کے رسول اور ہمارے سرکار! یہ ۱۲ ربیع الاول کی رات ہے، یہ رحمت وہدایت اور نورانیت کی مبارک رات ہے۔ یہ خیر و برکت اور سعادت کی مقدس رات ہے۔ یہ پرہیزگاری و نیکوکاری اور عبادت کی متبرک رات ہے، یہ انسانی تاریخ میں مساوات و اخوت کی کامیابی کی رات ہے، یہ آزادی اور حریت کی سب سے بڑی عید ہے، اور اے محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کی ولادت مقدس کی مبارک رات ہے۔

اور یہ دیکھئے! یہ ہیں آج کے مسلمان ـــــــ یہ چالیس کروڑ مسلمان ـــــــ یہ آج آپ کی ولادت مقدس کی یاد میں سارا دن ساری رات محفلیں منعقد کیا کرتے ہیں۔ اور ہاں! یہ دیکھئے! یہ ہیں آج کے منبر ـــــــ یہ فارس سے لاہور تک ایک کروڑ ہیں یہ منبر پیرس میں بھی ہیں اور نیویارک میں بھی ـــــــ اور اسی طرح لندن میں بھی ہیں اور ٹوکیو میں بھی ـــــــ آج ہر منبر پر آپ کی ولادت مقدس کا بیان ہو رہا ہے ـــــــ اور ہاں! یہ دیکھئے! یہ ہیں آج کے سینکڑوں قاری ـــــــ یہ خوش گلو طبقہ۔ آج قرآن حکیم کی آیات بینات کی نہایت دلکش اور پرسحر لحن داؤدی میں ترتیل فرمایا کرتا ہے۔

ہم نے بھی اس یادگار کے اعزاز میں کمال ادب و احترام اور تعظیم و تکریم سے اپنا نذرانۂ عقیدت و خلوص پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے، مکانات کی صفائی کر کے انھیں اپنے ذوق کے مطابق سجایا ہے۔ علم پھہرایا ہے اور چراغاں بھی کیا ہے۔ کلیوں کی سیج بچھا دی ہے۔ فصیح و بلیغ خطیبوں اسرار و رموز سے معمور تقریروں، خلوص، عقیدت، عشق و محبت، آرزو و تمنا اور جوش و ولولہ

سے بھرپور نعتیہ غزلوں، نظموں اور قصیدوں سے ملأ اعلیٰ کا گنبد گونج اٹھا ہے۔

کیا اب بھی آپ کی عظمت و تکریم اور عزت و تعظیم کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات رہ گئی۔ جسے ہم انجام نہیں دے سکتے ہیں؟ بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن ——— ہاں ——— اہل نظر جانتے ہیں کہ صرف ایک بات رہ گئی ہے، اور بہت ہی دشوار سی بات رہ گئی ہے، وہ بات یہ ہے کہ ہمیں یہ چاہیئے تھا کہ ایسے مواقع پر ہم آپ کے دین برحق کی طرف خلوص قلب کے ساتھ رجوع کریں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانیں۔ ہمارے افراد اور ہماری جمیعتوں کے ظاہر و باطن ایسے ہی ہو جائیں جیسا کہ آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ ضروری شئے ہے جسے آپ کی ولادت مقدس کی محفلوں کے انعقاد کے سلسلے میں پیش کرنا لازمی ہے۔ اور اسی کو ہم فراموش کر جاتے ہیں۔

یہ دیکھئے! آج تو یہ چالیس کروڑ مسلمان ہیں ——— لیکن وہ محض چالیس اصحاب جو دار ارقم میں آپ کے ساتھ تھے۔ وہ شجاعت میں ان سے بہت ہی آگے تھے اور باعتبار ایمان بھی ان سے افضل و اقویٰ تھے وہ اپنی اس قلت تعداد کے باوجود ان سے بہتر مرد میدان ثابت ہو سکے۔ اور انھوں نے دنیا پر ایک زبردست دھاک جمادی۔ وہ محض ایک تہائی قرن کے قلیل عرصہ ہی میں دنیا کی ایک تہائی آبادی کو اسلام کا پیرو کار بنانے میں کامیاب ہو گئے مگر ہم! ——— آہ! ہم نے اپنے گھروں کی چہار دیواریوں کے اندر بھی اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے۔ آہ! ہمارے وہ نوجوان لڑکے جنھیں مرد میدان ہونا چاہیئے تھا وہ دنیا و دین سے بے خبر ہو کر اپنا عشرت خانہ آباد کئے ہوئے ہیں۔ اور ہماری وہ نوجوان لڑکیاں جنھیں اپنی عصمت و عفت کی محافظ اور آنے والی نسل کی ایک لائق مسلم اور ماں ہونا چاہیئے تھا وہ گھروں کے باہر آوارہ گرد ہیں۔

یہ دیکھئے! آج تو یہ ایک کروڑ منبر ہیں لیکن وہ ایک منبر جو آپ کے لئے مدینہ منورہ میں نصب کیا گیا تھا جو خشک لکڑیوں کے چند دیبڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جس کے لئے نہ تو قبہ تھا اور نہ گیٹ۔ نہ قمقمہ تھا اور نہ نقاشی ——— وہ ان منبروں سے بدرجہا اعلیٰ و افضل تھا۔ اس لئے کہ اس پر سے جو صدائے حق بلند ہوئی اس نے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور اس پر جو عمل کیا گیا وہ نہایت برگزیدہ ہوا۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

آخر ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ اس نے اس پر سے جو دعوت دی تھی اس کی بنیاد صدق و اخلاص پر تھی اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا نے اسے قبول بھی کیا اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم آج ان منقش و مطلی منبروں پر آپ کی پیش کردہ دعوت کو بار بار دہراتے ہیں لیکن کوئی بھی لبیک نہیں کہتا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم جو کچھ بھی رشد و ہدایت پیش کرتے ہیں وہ محض زبانی ہے۔ اس کا ہمارے دل کی گہرائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا لوگ بھی اسے کانوں سے سن لیتے ہیں، واہ واہ کر دیتے ہیں اور دامن جھاڑ کر چلے جاتے ہیں۔

یہ دیکھئے! آج تو یہ سینکڑوں قاری ہیں ـــــــ لیکن آپ کے تھوڑے سے صحابہ کے وہ چند افراد جو قرآن مقدس کے صحیفے سے کچھ آیات بینات حفظ فرمالیا کرتے تھے، ان قاریوں سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع تھے۔ انھوں نے آیات کو پڑھا، سمجھا، حظ اٹھایا۔ مسائل کا استنباط کیا اور انھیں عملی جامہ پہنایا ـــــــ اور ہم تو آج قرآن مجید کی آیات کو ترتیل کے نام پر گنگنا گنگنا کر گایا کرتے ہیں۔

آپ نے ہمارے سامنے عقیدۂ توحید رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعثت نبوی کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہ تو کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع ـــــــ نہ تو کوئی اپنی طرف سے اس کی مرضی کے بغیر کچھ دے سکتا ہے اور نہ تو کوئی اس کے کرم کو روک سکتا ہے۔ لہذا نہ تو ہمیں کسی کی خوشامد کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی سے ڈرنے اور خوف کھانے کی حاجت۔

آپ نے ایام جاہلیت کے رسم و رواج کی ساری غیر معقول اور نامناسب باتوں کو ممنوع فرما دیا ہے۔ ہمارے اندر اخوت اور بھائی چارگی پیدا کر دی ہے۔ ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔ ہم سب کے سب محض ایک قبلہ کے نام پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم مختلف شہروں اور مختلف ملکوں کے رہنے والے ہوں، ہم محض ایک قرآن حکیم کے نام پر اکٹھے کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے رنگ جداگانہ اور ہماری زبانیں مختلف ہوں۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

لیکن آہ! افسوس ہے تو صرف اسی بات کا کہ ہم مسلمانوں نے آپ کی سچی تعلیمات کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ مختلف قسم کے خیالات اور عقائد اپنا لئے ہیں اور مختلف مملکتوں، قوموں، امتوں میں منقسم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے اندر امارت و تجارت کا لالچ آگیا ہے۔ لہذا نزاع باہمی پیدا ہوگئی۔ فرقہ بندیاں ہوگئیں اور آہ! قوم پرستی، فرقہ پروری اور غلط قسم کی وطنیت کے تعصب جیسے سیاہ اور مہلک امراض پیدا ہوگئے۔

آپ نے ہمیں صداقت و راست بازی کی تعلیم دی تھی۔ اور آپ کو اپنی تعلیم کی صداقت اور مؤمنین کی صداقت پر پورا اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ کیا ایک مومن زنا کاری کر سکتا ہے تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مومن اس گناہ کا مرتکب ہو جائے لیکن وہ فوراً توبہ کرلے گا۔ اور اس کے بعد ہمیشہ پرہیز کرے گا۔ پھر جب آپ سے پوچھا گیا کہ کیا ایک مومن چوری کر سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں بھی آپ نے یہی فرمایا تھا کہ ہاں ممکن تو ہے لیکن وہ توبہ بھی کرلے گا۔ لیکن جب آپ کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ ایک مومن جھوٹ بھی بول سکتا ہے تو آپ نے اس کے جواب میں بالکل واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہرگز نہیں، یہ بات ایک مومن کے شان کے خلاف ہے۔ آہ! آج ایمان کا دعویٰ کرنے والے دروغ گو یہ نہیں سوچتے کہ نہ منافقت جیسے معتوب گناہ میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ غور ہی نہیں کرتے کہ آپ نے کذب کو منافقت کا پہلا ثلث، وعدہ خلافی کو دوسرا ثلث، اور امانت میں خیانت کو تیسرا ثلث قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جس کسی نے بھی بغض و عناد جیسی قبیح صفت کو جگہ دی وہ ہم میں سے نہیں۔ اب اس سے زیادہ سخت توبیخ اور کیا ہو سکتی ہے۔

آپ نے ہمیں غیبت و چغل خوری سے روکا اور ذلت و رسوائی سے ہوشیار اور متنبہ کیا۔ ہم نے آپ ہی سے یہ بھی جانا کہ جن شہروں میں زنا کاری

شراب نوشی، سود خوری اور جوابازی عام ہوا کرتی ہے جس میں اللہ تعالےٰ کا غضب بھی نازل ہوا کرتا ہے

آپ نے عبادت ہی کے نام پر ہمیں تربیت (TRAINING) بھی دی تاکہ ہماری زندگی چھاؤنی کے کسی فوجی یا تعلیم گاہ کے کسی طالب جیسی پابندی اوقات ہو جائے ، اتنا ہی نہیں بلکہ آپ نے ہماری زندگی کو اس سے بھی کچھ زیادہ منضبط اور مستحکم طریقہ پر پابند اوقات دیکھنا چاہا ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ چھاؤنی ہو یا تعلیم گاہ ہر جگہ بوقت ضرورت بقدر حاجت یعنی مواقع کے پیش نظر ہی سہی پروگرام میں تبدیلیاں ہوتی ہی رہا کرتی ہیں۔ لیکن آپ نے نماز روزہ اور حج جیسے جیسے پروگرام بھی پیش فرمائے ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ہی نہیں۔ یہاں تو تبدیلی کے معنی بطلان ہی ہے۔ اوقات نماز میں تبدیلی غلط، روزہ کے وقت مقررہ میں تقدیم و تاخیر باطل اور حج کے وقت معینہ کے خلاف صعود عرفہ بے معنی ہے۔ آپ نے غض بصر، ستر عورت، صدق معاملہ، عزت و خودداری اور انکسار و تواضع کی تعلیم فرمائی ہے۔ ہمیں مومنین میں متواضع منکسر المزاج اور رحمدل رہنا چاہیئے اور کفار میں خوددار متین اور سنجیدہ ——— ہمارے چھوٹوں کو بڑوں کی عزت کرنی چاہیئے۔ اور بڑوں کو چھوٹوں کے ساتھ رحم و کرم اور محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیئے۔ ہماری عورتوں کو اپنے شوہروں کی مطیع، خدمت گزار ہونا چاہیئے۔ اور شوہروں کو اپنی بیویوں کے سامنے الفت و محبت، نرمی و ملاطفت اور اعتدال و ہمدردی کا تحفہ پیش کرنا چاہیئے۔ اولاد کو والدین کی خدمت میں اطاعت و احسان کا تحفہ بذریعہ عمل پیش کرنا چاہیئے۔ اور والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم و تربیت دیں، ہم میں سے ہر فرد کو اپنے فرائض منصبی محسوس کرنا چاہیئے اور اپنی حدود سے کسی حال میں بھی تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر مومن کو گھر کے اندر محبت و اخلاص کا پیش رو بننا چاہیئے۔ اور گھر کے باہر صدق و امانت کا نمونہ۔

لیکن آج ——— آج ہم ان تمام باتوں سے کتنی دور ہیں ! ! ——— کہاں ہیں ہم اور کہاں ہے اسلام ! ! اے اللہ کے رسول آج ہم جاہلیت کے دام فریب کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں بلکہ پہلے کی جاہلیت سے بھی زیادہ تباہ کن جاہلیت سے شکار ہو رہے ہیں۔ نہ تو

ہمارے اندر عربی سلیقے ہیں اور نہ اسلامی طریقے۔ ہم مبتلائے تعصب ہوگئے ہیں، ترکی مسلمان صرف ترک ہوکر رہ گیا۔ اور عربی مسلمان صرف عرب ——— اسی طرح کردستانی مسلمان کردیت میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ آج ہم نے اپنی جمعیت میں خود ہی تفرقہ پیدا کرلیا ہے اور اپنی وحدت ملی کو برباد کرڈالا ہے حتیٰ کہ آج خود ہم ہی نے اپنے ہی لئے بنائی ہوئی مسجدوں کو اپنے ہاتھوں مسمار اور منہدم کرکے رکھ دیا ہے

وہ جھنڈا جسے آپ نے کبھی اپنے دست مبارک میں لے کر بلند کیا تھا۔ آپ کی مطیع و فرمان بردار فوج کے فاتحین نے اسے روس و ترکستان اور چین و ہندوستان پہونچ کر نصب کیا پھر بھی ان کے بازوؤں کو ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ وہ لشکر جسے آپ نے حق و ہدایت، امن و عدالت کے پیام کا حامل بنایا تھا۔ اس نے آپ کی ودیعت آخر ساری دنیا کو پہنچا ہی دیا۔ اگرچہ سرکشوں کے تخت اور ظالموں کے تاج اس کی راہ کاٹتے ہی رہ گئے۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر ہم سے کوئی پوچھے ان غازیوں اور شہیدوں کی یادگار کیا ہے؟ تو ہم کیا بتائیں؟ ہماری نظر میں تو صفحۂ ارض پر یہ چند سرخ خطوط ہیں اور تاریخ عالم کی چند غیر فانی سطور ——— یہی وہ یادگاریں ہیں جو رہ رہ کر خون شہداء کی یاد دلاتی ہیں۔

اے اللہ کے رسول! آج فتح و ظفر کے جھنڈے لپیٹے جاچکے ہیں۔ تلواریں میانوں میں زنگ آلود ہوچکی ہیں۔ بہادری و شجاعت کی جو چنگاری تھی وہ بجھ چکی ہے۔ کبھی کی فاتح عالم فوج اس درجہ پست ہوگئی ہے کہ آج اس کا کچھ شمار ہی نہیں ہمارے بہادروں نے میدان خالی کردیا ہے اس لئے دشمن کو وسیع میدان مل گیا ہے۔ شیر ذلیل و حقیر ہوگیا ہے۔ اس لئے اس پر لازم کردیا گیا وہ بدبودار بچھو کا شکار کرے۔ اور مردوں کے سڑے گلے گوشت پر زندگی بسر کرے۔ جنگ یہود میں آپ کی امت کا امتحان ہوچکا۔ اس میں شک نہیں کہ یہود ہمارے مقابلہ کے نہ تھے، ہم اپنی کمزوریوں کے باوجود یہود سے ضرور مضبوط تھے لیکن اسے کیا کیجئے کہ خود ہمارے ہی اندر پھوٹ پڑگئی اور تفرقہ پیدا ہوگیا یہی وجہ ہے کہ ہمیں وہ سب کچھ سہنا پڑا جسے گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ دنیا کی سب سے ذلیل قوم بھی

ہمارے ملک پر مسلط ہوگئی، دشمن کو ہماری نااتفاقی ہی کے سبب غلبہ حاصل ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ دشمن مضبوط تھا اور ہم کمزور۔

لیکن اے اللہ کے رسول! پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں اس لئے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صرف کفار ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔ یہ امر ایک مومن کی شان کے خلاف ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے آپ کی امت کا ایک برحق طائفہ ہمیشہ ہی رہے گا قیامت تک اس کو دنیا کی کوئی سی مخالفت بھی مٹا نہیں سکتی۔

ہم میں کچھ نوجوان ہیں جو دین برحق کی راہ مستقیم پر گامزن ہیں انھوں نے خود کو اللہ کے سپرد کردیا ہے، شیطانی وسوسوں، نفسانی تقاضوں، دنیاوی نعمتوں، حسن وجمال، مال ومنال اور جاہ وجلال گویا جملہ فضولیات سے۔ انھیں اعراض واجتناب ہے وہ مساجد میں جا بیٹھے ہیں تلاوت کرتے ہیں اور درس نصیحت لیتے ہیں۔ اسی حال میں ان کی جوانی بیت رہی ہے، قہوہ خانوں، قحبہ خانوں اور بازی گاہوں کے اماموں محرمات حسن وجمال کی انگیٹھی میں سینکنے والوں، ناجائز اور نا محترم لذتوں سے اعصاب کو آسودہ کرنے والوں اور بدمستی وشہوت رانی کے پرستاروں میں بھی اب تغیر آرہا ہے۔ ان کی نفسانی خواہشیں اور اعصابی سرکشیاں انگیٹھی کی چنگاریوں کی طرح غائب ہورہی ہیں۔ آج ہم خود کو اس منزل پر پارہے ہیں جہاں خوف، دوزخ ہے اور شوق جنت ——— ہم میں کچھ نوجوان لڑکیاں بھی ہیں اور ان کے بھی زہد و ورع کا وہی حال ہے جو لڑکوں کے سلسلۂ بیان میں بتایا گیا ہے۔ ہم میں صلاح و تقوی کے حامل کچھ شیوخ بھی ہیں۔ ان کے پاس عمر بھر کے تجربات ہیں اور نوجوان ہی جیسے عزائم۔

اے اللہ کے رسول! یہ دیکھئے! یہ ہیں ہماری مسجدیں ——— نمازیوں سے بھری مسجدیں اور یہ ہیں ہمارے مطابع ——— جن سے روزانہ سینکڑوں دینی کتابیں اشاعت پذیر ہوا کرتی ہیں۔[1]

آج ہمارے اندر فتنہ وفساد کے خلاف عام رجحان ہے، آج ہم بیدار ہیں اور ہمارے اندر بیداری بھی عام ہے۔ ایک طویل شب غفلت گذری داعی نہضت وترقی نے ہمیں آواز دیا ہے۔ اب ہم نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب ہم پھر شبستان غفلت کی طرف رخ بھی نہیں کریں گے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

ساحرِ مغرب کا طلسم ٹوٹا، اس کا سحر باطل ہوا۔ آج ہم خود اپنے خیر و شر کی تمیز اور حق و باطل کا فرق محسوس کرتے ہیں۔ اب ہم مغرب سے مادی فن کے سوا اور کچھ بھی لینا نہیں چاہتے اور یہ صرف اس لئے کہ اس نے اس فن میں ہم سے سبقت حاصل کرلی ہے لیکن دین و اخلاق ؟ یہ اس کی چیز نہیں یہ ہماری چیز ہے، اسی کے سہارے انشاء اللہ الرحمٰن ہم فلاح و بہبود کی شاہراہ پر بڑھتے ہی چلے جائیں گے۔

آج شام کو جو آزادی نصیب ہوئی ہے بیس سال قبل ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ایک دن تھا جب کہ فرانسیسیوں کا ہر جگہ قبضہ تھا۔ ہمارے پہاڑوں اور ہمارے ٹیلوں پر ان کے قلعے تھے۔ ہماری چھاؤنیوں میں ان کی فوجیں تھیں۔ ہمارے حلقوں میں ان کے مشیر کار تھے اور ہمارے ہی اندر ان کے جاسوس تھے لیکن ـــــ لیکن جب اللہ کی مدد آئی تو ان میں کا کوئی بھی نہ رہا

آج عرب ممالک پٹرول کے ذریعہ خوشحال ہو گئے ہیں۔ شاید یہی وہ آگ ہے جس کے متعلق آپ نے یہ خبر دی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب یہ سرزمین حجاز سے برآمد ہوگی۔ ہم اپنے اس خدا سے جو ہماری اس خوشحالی کا مسبب ہے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس سرمایہ کو بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آج دنیا میں بڑی بڑی اسلامی سلطنتیں عرصۂ وجود میں آچکی ہیں۔ آج ہم پھر آپ کی ہدایت اور آپ کے دین کی طرف لوٹ رہے ہیں تاکہ ہم سچے مسلمان بن سکیں۔ صرف ظاہری اور زبانی مسلمان نہیں بلکہ قول و فعل اور ظاہر و باطن ہر دو اعتبار سے مسلمان بن سکیں۔

اور ـــــ اے اللہ کے رسول! ـــــ جس دن ہم ایسے ہو سکے صحیح معنی میں اسی دن ہم نے اصلی محفل میلاد منعقد کی اور آپ کی یادگار ولادت کے تقاضوں کے مطابق حقیقی تعظیم و تکریم بجالانے کا شرف حاصل کیا۔ ہم جانتے ہیں اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ وہ یادگار ہے جس سے زیادہ زندہ و پائندہ بنی نوع انسان کے قلوب میں اور کوئی یادگار ہو ہی نہیں سکتی۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

سیرت رسولؐ کے دو اہم ترین پہلو

مولانا صدر الدین اصلاحی

یوں تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا کوئی گوشہ نہیں جو کمال انسانیت کا آئینہ دار نہ ہو، لیکن اس کے دو اہم پہلو ایسے ہیں جو سب سے زیادہ بنیادی اور سب سے زیادہ اہم ہیں :۔

(۱) ایک تو یہ کہ آپ کے پاس جو حق تھا اسے آپ نے خلق تک، وقت کے وقت، جوں کا توں پہونچا دیا۔ اور کبھی اس بات کو روا نہ رکھا کہ اس کا کوئی جزو لوگوں پر واضح ہونے سے رہ جائے۔ آپ کو حکم تھا، اور نہایت زوردار لفظوں میں تھا کہ :۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔ (مائدہ) اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی جناب سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسے جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام پہنچانے کا حق ادا نہ ہوگا۔

گمان نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے اتنے زبردست فرمان کی تعمیل میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہوگی جب کہ آپ کو یہ بھی صاف صاف سنایا جا چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایتوں کا چھپانے والا لعنتی ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُوْنَ ۔ (بقرہ) اس لئے عقلاً یہ ممکن نہیں کہ آپ نے اللہ کے دین کو پورا پورا اور جوں کا توں لوگوں تک پہنچا نہ دیا ہو۔ یہ صرف قیاس اور عقیدت کی بات نہیں ہے۔ بلکہ واقعات کی قطعی اور کھلی ہوئی شہادت بھی یہی ہے۔ تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں ایک ثبوت بھی اس بات کا نہیں مل سکتا کہ آپ نے اس فرمان الٰہی کی تعمیل میں کوئی کوتاہی دکھائی ہو۔ حالانکہ جو کچھ آپ کو دنیا کے سامنے اس بے لاگ طریقے پر

رکھنا ہوتا تھا بسا اوقات وہ ماحول کے لیے یکسر نامانوس اور سننے والوں کے لیے سخت ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ لیکن ماحول کی مصلحتوں اور سننے والوں کے جذباتی ردعمل کا آپ نے کبھی کوئی ذہنی دباؤ قبول نہیں کیا، اور نہ کبھی دعوت حق کا مفاد آپ نے اس میں سمجھا کہ اس کے ایسے اجزاء کو جن سے لوگوں کے بھڑک اٹھنے کا زیادہ اندیشہ ہو، قابل گوارا بنا کر اور ان کے رنگ توحش کو کچھ ہلکا کرکے پیش کریں۔ ایک طرف تو عرب کی سرزمین تھی جو سینکڑوں خداؤں کی بیانہ مناری اور پرستش میں غرق تھی۔ دوسری طرف قرآن کا تصور توحید تھا جس میں کسی بھی زندہ یا مردہ "خدا" کی خدائی کے لیے کوئی گنجائش سرے سے موجود ہی نہ تھی، اور جو ضروری قرار دیتا تھا کہ ایک ایک غیر اللہ کی خدائی کا انکار کیا جائے۔ شرک کے ایسے زبردست مرکز میں توحید کے ایسے بے آمیز تصور کی منادی کیا کسی حال میں بھی قابل برداشت سمجھی جا سکتی تھی؟ آج کریملن کے اندر کھڑے ہو کر مارکسزم کے خلاف بولنا پھر بھی بہت آسان ہے، لیکن مکہ میں اور کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ کی منادی کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا مگر دنیا جانتی ہے کہ آپ نے یہ منادی ٹھیک انہی لفظوں میں کی، ہر مقام اور ہر موقع پر کی، اور اس طرح کی کہ نہ تو کبھی آپ کے لب و لہجہ میں کوئی کمزوری آئی اور نہ ان لفظوں کے معنی و مفہوم کو خوش نما بنانے کا آپ کے اندر کبھی کوئی رجحان پیدا ہوا۔ حالانکہ اس طرح کی "روادارانہ پالیسی" کے اختیار کر لینے کا خود مخالف کیمپ سے بھی کھلا اشارہ کیا گیا تھا اور اس وقت کیا گیا تھا جب طاقت و اقتدار کے لحاظ سے وہ آپ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تھا۔ لیکن ان باتوں کا بھی، اور وہ بھی ایسے سخت حالات میں آپؐ کے برملا اعلان حق پر کوئی اثر نہیں پڑا، اگر پڑا تو صرف یہ کہ اس میں اور زیادہ شدت آتی گئی، اور مخالفین کا ہر تازہ اظہار ناپسندیدگی دعوت توحید کی ایک تازہ تلقین و توضیح کا سبب بنتا گیا۔

جب توحید جیسے انقلابی اور ماحول کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت تصور کے بارے میں آپؐ کی صاف بیانی کا یہ حال تھا تو اسلام کے دوسرے عقائد اور تعلیمات کے بارے میں کسی اخفاء یا التواء یا ابہام کا سوال ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے؟

(۲) سیرت پاک کا دوسرا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ داعی اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ آپ "اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" بھی تھے۔ آپ نے جس عقیدے، جس اصول اور جس ہدایت کی بھی دوسروں کو تلقین کی اس کے تقاضوں پر سب سے پہلے خود عمل کیا۔ آپ جس حق کے مبلغ تھے اس کی تبلیغ آپ نے بیک وقت اپنی زبان اور اپنے عمل دونوں سے کی۔ اپنے ساتھیوں کو اگر یہ تاکید فرمائی کہ ذکر الٰہی اور حمد و تسبیح میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہو تو دنیا نے آپ کو بھی، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یادِ مولا میں مشغول دیکھا۔ اگر دوسرے اہل ایمان کو آپ کی یہ نصیحت تھی کہ دشمنانِ حق کی پیہم ایذا رسانیوں کا صبر سے مقابلہ کرتے رہو تو ان کے سامنے خود بھی سراپا صبر و ثبات بنے رہے۔ جب زبان مبارک نے یہ اعلان کیا کہ ان ظالم دشمنوں کا اب ہاتھ سے مقابلہ کرو تو میدان جنگ کی طرف سب سے پہلے اٹھنے والے قدم آپ ہی کے تھے اور اگر کبھی غیر معمولی حالات پیدا ہو جانے کے باعث ساتھی میدان چھوڑ بیٹھے تو اس وقت بھی حق کا یہ ستون اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ جنگی ضرورت سے اگر خندقیں کھودنے کا فیصلہ ہوا تو دوسروں کی طرح آپ کے ہاتھوں سے بھی پھاوڑے چلتے دیکھے گئے۔ تنگ حالی کے عالم میں اگر اوروں کے پیٹ پر ایک ایک پتھر بندھے تھے تو دامن مبارک کے نیچے دو دو پتھر بندھے پائے گئے۔ غرض دینی احکام و ہدایات کا کوئی جزء نہیں، اور بندگی کا کوئی پہلو نہیں جس میں آپ کا اپنا عمل دوسروں کی رہنمائی کے لئے آگے آگے موجود نہ رہا ہو۔ یہ صرف آپ کا جذبۂ عمل ہی نہ تھا بلکہ آپ کو حکم بھی اسی بات کا تھا:۔

قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ	اے نبی! کہہ دو مجھے حکم ہے کہ اللہ کی بندگی کروں طاعت کو
الدِّیْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ	اسی کے لئے کرتے ہوئے، اور مجھے حکم ہے کہ میں سب سے
(زمر)	پہلا طاعت گذار بنوں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کے "اول المسلمین" ہونے کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ بعض اوقات جب مصالح نے تقاضا کیا تو آپ کی نجی زندگی کی وہ آزادی بھی باقی نہ رہنے دی گئی جو شریعت کی طرف سے ہر شخص کو ملی ہوئی ہے۔ مثلاً نکاح کا معاملہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، اس بات کا فیصلہ کرنے میں وہ بالکل آزاد ہے کہ شرعی حدود اور معروف کے اندر وہ جس عورت سے چاہے نکاح کرے، جس

سے چاہے نہ کرے، مگر ایک خاص مصلحت دینی کی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک خاتون (حضرت زینبؓ) سے نکاح کر لینے کا مکلف بنا دیا گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح عرب جاہلیت میں جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دوسری تمام جاہلی اور غلط رسوم کی طرح اس رسم کو بھی اسلام نے موقوف قرار دیدیا۔ مگر پرانی رسموں کا اثر مسلسل تعامل کی وجہ سے سماج کے ذہن میں جس گہرائی تک اترا ہوا ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس رسم کے خلاف عمل کی ابتدا کرنا سخت مجاہدے کی بات تھی۔ اتفاق کی بات کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ نے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے، اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ اگرچہ بعض اہم مصالح کا تقاضا آپ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت زینب کو اپنے عقد نکاح میں لے لیں۔ مگر وہی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ ہونے کی بنا پر اس بات کا قوی اندیشہ، کہ معاشرے میں ابھی اس نکاح کا اچھا خاصا خراب ردعمل ہوگا۔ جھجک میں ڈالے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک معاملہ کی عام نوعیت کا تعلق تھا یہ آپ کا بالکل نجی معاملہ تھا، اور آپ کے لئے اس لحاظ سے دونوں راہیں یکساں طور سے کھلی ہوئی تھیں نکاح کر لینے کی بھی، اور نہ کرنے کی بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ کو یہ نکاح ضرور کرنا چاہیئے۔ بلکہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے اس رشتہ نکاح کو جوڑ کر اس کا اعلان فرما دیا (زَوَّجْنَاكَهَا) ایسا کیوں ہوا؟ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس ذاتی معاملہ میں آپ کی آزادی عمل کیوں برقرار نہ رہنے دی؟ اس کا جواب خود اسی کے لفظوں میں سنئے:۔

....زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ (احزاب)	....ہم نے اسے تمہارے نکاح میں دیدیا تاکہ اہل ایمان کے لئے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں، جبکہ وہ ان سے اپنی غرض پوری کر چکیں، نکاح کر لینے میں کوئی تنگی نہ رہ جائے۔"

یعنی چونکہ امت پر سے ایک ناروا بندش کو ختم کرنا تھا اور اس سلسلے میں دوسروں کے لئے زبردست نفسیاتی رکاوٹیں تھیں، اس لئے یہ "اول المسلمین" ہی کا کام تھا کہ آگے بڑھے اور بڑھ کر راہ عمل کھول دے۔ اس ایک مثال سے پوری صورت واقعی اچھی طرح سمجھ میں آ جا سکتی ہے اور اندازہ کر لیا جا سکتا ہے

کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے "اول المسلمین" ہونے کے کیا معنی تھے ؟

اب ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں امتیازی خصوصیتیں زندگی بھر اتنی مضبوطی سے کیوں بنائے رہے؟ کیا بات تھی کہ سیرت پاک کے سراپے میں یہ دونوں اوصاف اتنی نمایاں اہمیت کے ساتھ موجود نظر آرہے ہیں ؟ بلاشبہ اس کا آسان اور سیدھا سادا جواب تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو حکم ہی اس طرح کا تھا۔ لیکن اس جواب پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تھا کیوں ؟ آخر اس حقیقت کو تو حقیقت ہی ماننا جائے گا کہ اس کا کوئی حکم بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر حکم کسی نہ کسی گہری حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر سوچئے کہ آپ کو جو کام سپرد کرکے بھیجا گیا تھا اور جو دین حق کی تبلیغ و اقامت کے سوا اور کچھ نہ تھا، اس کے پیش نظر ان دونوں باتوں کا حکم کن مصلحتوں اور حکمتوں کا حامل ہو سکتا ہے ؟ جہاں تک معروف اندازِ فکر کا تعلق ہے وہ تو کسی ایسی غیر معمولی انقلابی دعوت و تحریک کے سلسلے میں، جو انسانی زندگی کے ڈھانچے کو پوری طرح ادھیڑ دینا اور ادھیڑ کر بالکل نئی بنیادوں پر پھر سے تعمیر کرنا چاہتی ہو، اس طرح کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت نہیں دیتا، بلکہ کم از کم پہلی چیز کو تو دانش مندی کے بھی خلاف سمجھتا ہے۔ اس بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ جس تحریک کا منشا سماج میں کوئی غیر معمولی تبدیلی لانا ہو ابتدا ہی میں اس کا واضح اور صاف صاف تعارف عوامی جذبات کو لازماً بھڑکا دیا کرتا ہے، اس لئے حسن تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے اصل اور آخری مدعا کا پہلے ہی قدم پر کیا، مدتوں پتہ نہ چلنے دیا جائے، بلکہ لوگوں کی نگاہیں دیکھ کر باتیں کی جائیں اور ان کی قوت برداشت کی حد تک اسے کم وحشت انگیز بلکہ خوش نما بنا کر پیش کیا جائے۔ پھر جب ایک خاص حد تک لوگ ہموار ہو جائیں اور کچھ طاقت بھی فراہم کر لی جائے تب کہیں جا کر اپنے اصل مدعا کا برملا اظہار کیا جائے۔ یہ فیصلہ کچھ آج ہی کے "معروف اندازِ فکر" کا نہیں ہے بلکہ خود اس زمانے میں اور اس ملک میں بھی لوگوں کے سوچنے کا انداز کچھ اسی طرح کا تھا جس میں آپ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ آپ کو اور آپ کے مخلص ساتھیوں کو اسی بنا پر ایک مدت تک، العیاذ باللہ فریب خوردہ اور بے وقوف قرار دیا جاتا رہا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول خدا صلی اللہ علیہ

وسلم کا طریق کار اس معروف انداز فکر وطریق کار کے بالکل مخالف رہا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ دعوتِ حق کا مفاد اسی بات کا متقاضی تھا کیونکہ یہ بات حکیم وخبیر خدا کی شان سے یکسر بعید ہے کہ وہ اپنے رسول کو ایسی پالیسی اختیار کرنے کی ہدایت کرے جو اس کے مقصد بعثت کے حصول میں مفید ہونے کے بجائے الٹا اسے نقصان پہنچانے والی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر اسلامی تحریکوں پر اسلامی دعوت کو قیاس کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ غیر اسلامی تحریکوں کے لیے اپنے مقصد کا گول مول اظہار اور اپنے اصول ونظریات کا پیچ رُخا تعارف ضرور مفید مطلب ہوتا ہے، بلکہ شاید ضروری بھی ہوتا ہے کیونکہ یہی پالیسی ان کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کی نظریاتی بے مائگی کے حسب حال ہوتی ہے۔ مگر دعوت حق کو یہ پالیسی کبھی راس نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کا اختیار کرنا خود اس بات کی دلیل بن جائے گا کہ اس دعوت کو اپنی غرض وغایت کی حقانیت پر خود ہی اطمینان نہیں ہے، اور عملاً ہوگا یہ کہ ابتداء کے ساتھی درمیان ہی میں ساتھ چھوڑ جائیں گے، موثر الزامات اور معقول اعتراضات کا اک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور اگر بہزار دقت ورسوائی کسی منزل تک رسائی ہو بھی گئی تو وہ قیام دین کی منزل بہرحال نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اس پالیسی سے دعوت حق کا مزاج بھی کسی طرح میل نہیں کھاتا کیونکہ اپنے مقصد ومدعا کا یہ طرزِ تعارف بجائے خود ایک مہذب قسم کا جھوٹ ہے، اور جھوٹ کا سہارا پکڑنے کا ننگ، خواہ وہ کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو، اس حق کی خودداری اور بے لاگ فطرت کبھی گوارا نہیں کر سکتی جو زمین پر آیا ہی اس لیے ہے کہ اسے جھوٹ اور باطل سے یکسر پاک کر دے۔ ان وجوہ کو اگر سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اپنے مقصد دعوت کا واضح اعلان واظہار محض آپؐ کی جرأتِ حق گوئی ہی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے یہ ضرورت بھی کام کر رہی تھی کہ اسلام کی تبلیغ واقامت اور لیظہرہٗ علی الدین کلہٖ کی منزل تک رسائی اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔

رہا سیرتِ پاک کا دوسرا پہلو، تو اگرچہ دوسری تحریکوں میں اسے خلاف دانش نہیں سمجھا جاتا، مگر ضروری بھی نہیں مانا جاتا۔ چنانچہ اس طرح کی تحریکوں کا اگر آپ جائزہ لیں تو پائیں گے کہ ان کے علم بردار اپنے مسلک کے چاہے بڑے اچھے "مسلم" رہے ہوں مگر "اول المسلمین" ہرگز نہ تھے۔

اور اس کے باوجود بھی وہ کامیاب ہو گئیں۔ لیکن دعوتِ اسلامی کا معاملہ اس باب میں بھی بالکل مختلف ہے۔ اگر اس دعوت کا پیش کرنے والا ایک طرف تو اسے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کہتا اور اس کی پیروی ہی پر دارین کی فلاح موقوف ٹھیراتا ہو، دوسری طرف اس کا اپنا عمل اس کے اعلیٰ تقاضوں کی زندہ مثال نہ پیش کرتا ہو، تو دنیا اس کی طرف کبھی نہیں آسکتی۔ اس قسم کی "تبلیغ حق" کو تبلیغ حق کہنا ہی غلط ہے۔ اسے تو حق کی بس پیشہ ورانہ وکالت کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کی "تصوریت" "عملیت" کا جامہ کس طرح پہنتی ہے، یہ بات اس وقت تک جانی نہیں جا سکتی تھی جب تک کہ قرآن کے ساتھ رسولؐ بھی نہ آتا۔ اور وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی تصورات کی، اسلامی اعمال کی اور اسلامی اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنا کر لوگوں کے سامنے رکھ نہ دیتا۔ اس لئے حقیقت واقعی یہ ہے کہ سیرت رسولؐ کے بغیر اسلام کو ٹھیک طور سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا، اور اگر ایک چیز کے بغیر اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھا بھی نہیں جا سکتا تو ظاہر بات ہے کہ اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا امکان تو اور دور جا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر سیرت نبوی کا ذکر و مطالعہ تسکینِ عقیدت کا نہیں بلکہ حفاظتِ دین و ایمان کا اور ادائے حقوق اسلام کا مسئلہ بن جاتا ہے اس لئے اس تذکرے اور مطالعے کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اس سے مومن ہونے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ معلوم کیا جائے۔

سیرت رسولؐ کا مطالعہ اگر اس صحیح نقطۂ نظر سے کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ سیرت کے یہ دونوں پہلو، جن کا اوپر کی سطروں میں ایک مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے، اپنی اصل حیثیت ہی کے لحاظ سے اہم ترین نہیں ہیں، بلکہ آج کل ملت اسلامیہ جس حالت میں ہے اس کے لحاظ سے بھی اہم ترین ہیں آج کوئی آنکھ نہیں جو ملت کا حال دیکھ کر ٹھنڈی رہ جائے اور کوئی زبان نہیں جو اس پر ماتم سرا نہ ہو یہ صورت حال جس وجہ سے پیدا ہوئی ہے اُس کی اِس سے زیادہ صحیح اور موزوں تعبیر اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ سیرت رسولؐ کے ان دونوں پہلوؤں سے، جو سب سے زیادہ اہم تھے، ملت نے سب سے

زیادہ غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اسلام جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے، اسے جوں کا توں ظاہر کرنا احتیاط اور زمانہ شناسی کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اور ایسا سمجھنا دانش مندی کا فیشن بن گیا ہے۔ اور اگر بعض حلقوں میں ایمانی خودی کچھ زور دکھاتی بھی ہے تو عموماً صرف زبانی اعتراف و اظہارِ خیال کی حد تک، ورنہ جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے اس کی راہ میں یہاں بھی وہی احتیاط پسندی چٹان بن کر آکھڑی ہوتی ہے۔ اس طرزِ فکر و عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے جن حصوں پر عمل کی کوشش ماحول کو پسند نہیں ہوتی ان کا یا تو زبان پر ذکر ہی نہیں آنے پاتا، یا پھر عقیدت و تحسین کا خراج ادا کر کے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے اور ان کی حد تک عملی زندگی بدستور دوسری ہی لائنوں پر سفر کرتی رہتی ہے جس شخص کو بھی اسلام کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ اس حقیقت کو مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ بندگی کا ایک جامع نظام ہے، جس سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی باہر نہیں، وہ اپنے پیرووں سے جس اطاعت کا مطالبہ کرتا اور جس بندگیٔ رب کی بجا آوری چاہتا ہے اس کی حدیں اگر مسجد کے گوشۂ ذکر و فکر سے شروع ہوتی ہیں، تو مملکت کے نظم و انصرام سے پہلے ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن کیا آج ملت کو دیکھ کر نہ سہی، اس کی باتوں کو سن کر ہی، کوئی اسلام کو ایسا جان اور سمجھ سکتا ہے ؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ ہماری بہت بڑی اکثریت یا تو اس امرِ حق سے واقف ہی نہیں، یا اسے زبان پر لانے کی بھی جرأت کھو بیٹھی ہے۔ وہ اسلام کی وضاحت عموماً اس انداز میں کرتی رہتی ہے جس سے وہ ہماری زندگی کے ایک پرائیویٹ معاملہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ثابت ہوتا، جس کے ساتھ اجتماعی زندگی میں کسی بھی "ازم" کو لا کر بآسانی جوڑ دیا جا سکتا ہو، بلکہ زیادہ "محتاط" لوگ تو علانیہ فرمایا کرتے ہیں کہ دین کو دنیا سے، اور مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں، دونوں کے دائرے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس "بڑی اکثریت" سے آگے بڑھئے تو ان لوگوں میں سے بھی، جو بحمد اللہ اس جہل اور اس کتمانِ حق دونوں کی بیماریوں سے محفوظ ہیں، بہتوں کو ایک دوسرا روگ چمٹا دکھائی دے گا۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ فرماتے تو ضرور نظر آئیں گے کہ اسلام ہی ایک برحق دین ہے۔ انسانی اور عالمی مذہب ہے۔ ایک جامع نظامِ حیات ہے، دنیا کو امن و سلامتی کی اگر تلاش ہے تو یہ تریاق اسے اسلام ہی عطا کر سکتا ہے اور انسانی زندگی کے سارے

مسائل کا حل اسی کی تعلیمات میں مل سکتا ہے ۔ لیکن ان کی عملی دلچسپیوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان کی صرف "حدیث بزم" ہے جس کے اندر "حدیث رزم" بننے کی کوئی امنگ بمشکل ہی محسوس کی جا سکتی ہے ۔ اظہار اس ایمان، عقیدے اور یقین کا کہ انسانیت کی فلاح صرف اسلام سے وابستہ ہے ۔ اور انسانی مسائل کی کنجی صرف قرآن ہے مگر لائحہ عمل میں ہر نظام کی خدمت گذاریوں کے لئے پوری پوری جگہ اگر جگہ نہیں تو صرف اسلامی نظام کی خاطر سعی و جہد کے لئے بلاشبہ حالات کا دباؤ کم سخت نہیں مگر "اول المسلمین" کا اسوۂ حسنہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کے تقاضے پورے کئے جائیں۔

کاش سیرتِ رسول کا مطالعہ امتِ رسول کو یہ حقیقت سمجھا دیتا کہ اس کی کھوئی ہوئی دولت واپس نہیں مل سکتی جب تک کہ سیرت پاک کے ان دونوں اہم ترین پہلوؤں کا جرأت اور بے خوفی سے اتباع نہ کیا جائے ۔

تاریخ اسلام
ماہ و سال کے آئینے میں

ولادت نبوی صلعم	۹ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل	مطابق	۲۲ اپریل	سنہ ۵۷۱ء	بروز سوموار
بعثت نبوی	۹ ربیع الاول سنہ ۴۱ ولادت نبوی	مطابق	۱۲ اپریل	سنہ ۶۲۸ء	بروز سوموار
معراج نبوی	۲۷ رجب سنہ ۵۰ ولادت / ۱۰ نبوت	مطابق	۲۲ مارچ	سنہ ۶۳۱ء	بروز سوموار
ہجرت نبوی	۲۷ صفر سنہ ۱۳ نبوت	مطابق	۱۲ ستمبر	سنہ ۶۲۲ء	بروز بدھ
غار ثور سے روانگی	یکم ربیع الاول سنہ ۱۳ نبوت	مطابق	۱۶ ستمبر	سنہ ۶۲۲ء	بروز سوموار
قبا میں نزول	۸ ربیع الاول سنہ ۱۳ نبوت	مطابق	۲۲ ستمبر	سنہ ۶۲۲ء	بروز سوموار
تحریک اسلام کا پہلا جمعہ	۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ یا سنہ ۱۳ نبوت	مطابق	۲۷ ستمبر	سنہ ۶۲۲ء	
تاریخ اسلام کی پہلی جنگ	۱۷ رمضان المبارک سنہ ۲ بمقام بدر	مطابق	۱۶ مارچ	سنہ ۶۲۴ء	بروز منگل
سلاطین عالم کو پہلا تبلیغی خط	یکم محرم الحرام سنہ ۷ھ	مطابق	۱۴ مئی	سنہ ۶۲۷ء	بروز بدھ
مکہ میں فاتحانہ داخلہ	۲۰ رمضان المبارک سنہ ۸ھ	مطابق	۱۴ جنوری	سنہ ۶۳۰ء	بروز جمعرات
حجۃ الوداع	۹ ذی الحجہ سنہ ۲۳ نبوت سنہ ۶۳ ولادت	مطابق	۹ مارچ	سنہ ۶۵۰ء	بروز جمعہ
وفات نبوی	۱۳ ربیع الاول سنہ ۲۳ نبوت سنہ ۶۳ ولادت	مطابق	۱۱ جون	سنہ ۶۵۱ء	بروز سوموار

خصوصی پیشکش سہ روزہ دعوت دہلی

ہجرت نبویؐ اور اس کے نتائج

الاستاذ احمد عبدالغفور عطار (مکہ مکرمہ)
ترجمہ: [illegible] اعظمی

ہم اس مقالہ میں تاریخی حیثیت سے کچھ لکھنا نہیں چاہتے کیونکہ قدیم و جدید مورخین نے ہجرت کے اس پہلو پر اتنی ہمہ گیر روشنی ڈالی ہے کہ اب اس پر اضافہ کرنا مشکل ہے، ہاں اس حیثیت سے گنجائش باقی ہے کہ ہجرت کے اسرار و حکم اور ہجرت سے پیدا شدہ انسانیت عامہ کے عروج و کمال پر تتبع و اجتہاد کر کے کچھ تحریر کریں۔

ہجرت (ترک وطن) محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی مخصوص شے نہیں اور نہ یہ کوئی نئی چیز ہے آپ سے قبل بھی اللہ کے اولوالعزم پیغمبروں نے اور دوسرے لوگوں نے ہجرتیں کی ہیں تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ حضرت نوح، لوط، داؤد، یعقوب، یوسف، موسیٰ، عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی انسانیت کش ظالمانہ نظام سے بچ کر انسانیت کو صالح اور عادلانہ مضبوط دستور حیات دینے کیلئے ہجرتیں کی ہیں۔

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ آپ نے کوئی بھی ایسی چیز پیش نہیں کی جو حیات انسانی کی طبیعت و فطرت سے ماوراء یا مخالف ہو۔ چنانچہ جس طرح موسیٰ و عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام نے محیر العقول معجزات پیش کر کے اپنی طرف بلایا، اس طرح آپ نے نہیں کیا۔ کیونکہ خارق عادت چیزیں تو نبیوں اور رسولوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی صادر ہوا کرتی ہیں اگرچہ نبیوں کے خوارق کو معجزات اور غیر نبی کے خوارق کو شعبدہ بازی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ فرق اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ حق و باطل میں امتیاز رہے اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ عورت و مرد کا باہمی ملاپ اگر مشروع طریقہ سے ہو تو اسے نکاح و ازدواج کہتے ہیں اور اگر غیر شرعی ہو تو اس کو زنا اور حرام کاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں بہت سے ایسے معجزات اور مشاہدات کا ظہور ہوا جو آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرتے ہیں لیکن آپ نے معجزات و خوارق پر توجہ نہ فرمائی بلکہ آپ

اس طلب میں بے قرار رہتے کہ کسی طرح انسانیت کے اثبات کے ساتھ ساتھ رسالت کا اثبات ہو جائے اور رسالت و انسانیت کا وہ تضاد جو لوگوں کے ذہنوں میں ہے ختم ہو جائے۔ اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے:-

"میں (تمھاری ہی طرح) ایک ایسی قریشی عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑے کھا کھا کر گذارہ کرتی تھی"

آپ نے شادی بھی کی، آپ کھاتے پیتے بھی تھے۔ آپ نے لڑائی بھی کی، قرض بھی لیا اور ادا کیا، غرض ہر وہ چیز جو کسی شریف انسان پر گذرتی تھی وہ آپ پر بھی گذری۔ آپ مزاح و خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے تھے اور دلچسپی کی باتوں سے آپ خوش بھی ہوتے تھے۔ آپ اور انسانوں کی طرح اچھے کھانوں اور خوشبو دار چیزوں سے فرحت بھی محسوس کرتے تھے، بدن اور کپڑوں کی صفائی کا بھی اہتمام کرتے تھے اور ہنستے اور روتے بھی تھے، انسانی زندگی جو کچھ کرتی ہے وہ آپ بھی کیا کرتے تھے۔

انسانی زندگی کے یہ لوازمات تھے جن کی بنا پر لوگوں کی سمجھ سے یہ بعید ہوا کہ آپ انسان ہوتے ہوئے ان معجزات کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں معجزات تو انسان کی بساط سے باہر شئے ہے۔ اور آپ یہ چاہتے تھے کہ انسانی مقدرت سے باہر کوئی چیز صادر نہ ہو تو بہتر ہے، یہی وجہ ہے کہ جب مشرکین آپ سے معجزہ طلب کرتے تو آپ یہ خیال کر کے نظر انداز کر جاتے کہ کہیں ان کی مدت حیات معجزہ کے بعد تنگ نہ کر دی جائے۔ کیونکہ گذشتہ انبیاء نے مشرکین کے چیلنج کو قبول کر کے جب معجزے پیش کئے اور اس کے باوجود جب امتوں نے کفر پر اصرار کیا تو عذاب الٰہی نازل ہوا جس نے ان کا صفایا کر دیا۔ محمد رسول اللہ چونکہ خاتم الرسل تھے اور آپ کی دعوت قیامت تک کے لئے تھی اس لئے آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ معجزہ پیش کریں اور انکار کی صورت میں آپ کی امت دنیا سے نیست و نابود کر دی جائے۔

یہ وہ خصوصیت ہے جس نے آپ کو جملہ انبیاء کرام سے ممتاز کر دیا ہے۔ مزید براں خود ہجرت قرآن کے بعد بہت بڑا معجزہ ہے کیونکہ آپ کی ہجرت سے ایسے ایسے دور رس نتائج کے چشمے ابل پڑے جن کا تصور بھی آپ کے صحابہ کرامؓ کو نہ ہوا تھا لیکن جب یہ نتائج ظاہر ہو گئے تو ان کو اپنے اس رسول پاک اور

زیادہ کامل ایمان ہوگیا جس کی ذات خود ایک مستقل معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ وہ شخص ذوقِ سلیم اور ادراک و تمیز سے خالی ہے جو یہ کہے کہ قرآن اللہ کا نہیں بلکہ محمد کا کلام ہے۔ اور آج کل کے مغربیت زدہ جو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرتے ہیں وہ حقائق سے اتنے کورے ہیں کہ ظاہری اور خارجی حقیقتوں سے بھی ان کا دامن عقل و فہم عاری ہے۔

قرآن کے ابتدائے نزول سے لے کر ایسے ایسے شعراء و ادباء عرب پیدا ہوئے جن کی بڑی شہرت ہوئی لیکن ان کے نظم و نثر میں ایک بھی ایسا شاہکار نہیں جو قرآن کے معجزانہ اسلوب کے قریب بھی پھٹک سکے۔ حالانکہ ان کی قوت اختراع کا حال یہ تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے عظیم شاعر کا اسلوب اختیار کرتا تو اس درجہ نقالی میں کمال کر دکھاتا کہ اصل و نقل میں امتیاز مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ ابن درید، حماد اور خلف وغیرہم نے اشعار کہہ کر جاہلیت کے مجموعۂ کلام میں اپنے کلام کو خلط ملط کر دیا تو یہ فرق کرنا مشکل ہوگیا کہ کون جاہلیت کا کلام ہے اور کون بعد کا۔ گویا بعد کے شعراء نے الفاظ، معانی، منظر کشی، نغمگی ہر چیز میں دورِ جاہلیت کے شعراء کا کامل نمونہ پیش کر دیا۔

لیکن قرآن پر ساڑھے تیرہ صدیاں گذر گئیں پھر بھی آج تک اس کی ایک سورت بلکہ ایک آیت سے ملتی جلتی کوئی سورت یا آیت پیش کرنے سے زبانِ عالم گنگ ہے اور قرآن کا یہ چیلنج اب تک اپنی جگہ پر ہے:

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا	اگر قرآن کے اللہ کا کلام ہونے میں تم کو شک ہے تو اس جیسی
بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداءکم	ایک سورت بنا کر پیش کرو اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو
من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ط	بھی اس مہم میں شریک کر لو۔ اگر تم سچے ہو تو کر دکھاؤ۔

اس جیسی سورت یا آیت پیش کرنے سے انسانوں کا عاجز رہنا اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے اگر انسان کا کلام ہوتا تو زبان دان ادباء عالم اس کی مثال پیش کر سکتے تھے لیکن ان کی عاجزی کہہ رہی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

قرآن کے ماسوا دوسرے جتنے معجزات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں وہ سب انسانی فطرت کے

مطابق ہیں لیکن پھر بھی آپ نے بعض ایسے اعمال کے ذریعے تاریخ عالم کا رخ موڑ دیا کہ اس کی نظیر پیش کرنے سے انسان قاصر ہے۔ آپ نے کمزوری اور فرار کی ظاہری نمود سے ایسے دور رس نتائج کا استخراج کیا کہ ضعف و فرار ہی کی بنیاد پر بڑے بڑے محل تعمیر ہو گئے جو انسانی بساط سے باہر ہیں۔

انسانی فطرت کے مطابق جو جو معجزات ظہور میں آئے ان میں سے ایک "ہجرت" بھی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان میں سب سے بڑا معجزہ ہے۔ ہجرت سے ایسے ایسے عظیم الشان نتائج ظہور میں آئے کہ چند سالوں میں عالم انسانیت کے رخ کو موڑ دیا۔ اگر ہجرت کے ذریعہ صرف ایک چھوٹے سے شہر میں انقلاب رونما ہو جاتا تب بھی یہ معجزہ ہوتا مگر یہاں تو یہ عالم ہوا کہ روئے زمین کے تمام خطوں، قوموں اور قبیلوں میں ہجرت کے نتائج نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

تمام دنیا میں انقلاب کیسے ہوا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں جو کامل تبدیلیاں آئیں وہ سب لوگ جانتے ہیں۔ یورپ میں اسلامی تمدن کا نفوذ ہوا جس کا اعتراف خود یورپ والوں کو بھی ہے اور یورپ نے اسلامی تہذیب و ثقافت اور فہم و فکر کی دولت مسلمانوں سے حاصل کر کے امریکہ، آسٹریلیا اور دوسرے خطوں میں اپنے اثرات چھوڑے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمدن، اسلامی تمدن کے علاوہ تھا۔ کیونکہ اس وقت تین تمدنوں کا چرچا تھا۔ تمدنِ فارس، تمدنِ یونان اور تمدنِ روم، لیکن یہ تینوں تمدن اپنی موت مر چکے تھے اور اسلام سے پہلے کا یا اسلام کا معاصر کوئی تمدن باقی نہیں رہا تھا ان کی جگہ ایسے تمدن نے لے لی جو بالکل اسلامی تھا یا ایسے تمدن نے لی جس کا ماخذ مسلمانوں کا تمدن تھا۔

ہجرت نبوی کو ہم معجزہ کیوں کہتے ہیں؟ اس کی دلیل یہ ہے کہ سینکڑوں سلاطین، امراء اور لیڈروں نے بالکل اسی طرح ترک وطن کیا جس طرح رسول اللہ نے کیا لیکن ان کی ہجرتوں کے نتائج کمزور، محدود اور تنگ رہے، صرف اسی خطہ تک ان کی ہجرتوں کے پھل پھول محدود رہے جہاں یہ واقعہ ہوا تھا اور چند ہی لوگوں تک اس کے اثرات رہے لیکن رسول اللہ کی ہجرت نے اپنے نتائج و منافع کو تمام عالم انسانیت پر بکھیر دیا اور خیر و صلاح کا تلاطم ناپیدا کنار ساری دنیا کو محیط ہو گیا۔

سرزمینِ دعوت حق کی خصوصی پیش کش

اس مختصر سے مقالہ میں ہجرت کے معانی، اسرار و حکم اور اس کے نتائج پر پوری روشنی ڈالنی مشکل ہے ہاں جس طرح ہم اپنی ایک چھوٹی سی انگلی سے سورج جیسی بڑی چیز کی طرف اشارہ کر کے بتاتے ہیں جس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انگلی پورے سورج کو محیط ہے اسی طرح ہم ہجرت کے طویل الذیل نتائج و معانی کی طرف صرف اشارہ ہی کرتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور آپ کے ساتھ آپ کے رفیق حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی ہجرت کی، دونوں نے وطن مالوف، مال و دولت، اہل و عیال اور خاندان و قبیلہ کو قربان کر دیا۔ اسی طرح آپ کے دوسرے مہاجرین ساتھیوں نے بھی قربانی پیش کی اور ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں کہ کوئی زندہ انسان ان کو برداشت نہیں کر سکتا۔

مہاجرین میں پہلا نمبر ابو سلمہ عبد اللہ کا تھا۔ انھوں نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے جبر کیا کہ تم اپنے ساتھ اپنی بیوی اور لڑکے کو نہیں لے جا سکتے یا تو مکہ میں رہ جاؤ یا جانا ہے تو تنہا نکل جاؤ۔ ابو سلمہ نے ہجرت اختیار کی اور بیوی بچہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا۔

صہیب رومی نے ہجرت کا ارادہ کیا تو روسا مشرکین نے گھیر لیا اور کہا کہ اگر ہجرت کرنی ہے تو اپنا یہ مال کثیر تمھیں چھوڑنا ہوگا۔ صہیب نے خوش خوش اپنی ساری دولت چھوڑ دی اور ہجرت کا سودا کر لیا۔ رسول اللہ نے اس سودے کے بارے میں فرمایا " صہیب فائدے میں رہے "۔

دیکھئے یہ دونوں اپنی محبوب ترین چیزیں اور اثاثہ حیات کو چھوڑ کر کس قدر خوش خوش مکہ پہونچے ابو سلمہ کے دل کو اعزا کی محبت چٹکے لگا رہی ہوگی اور صہیب نے خون پسینہ ایک کر کے جو دولت کمائی تھی ان کے دل کو موڑ رہی ہوگی مگر ان دونوں نے سب کچھ مشرکین کے حوالہ کر کے ہجرت اختیار کی، اور اس پر رنج و الم کے بجائے یہ سوچ کر مسرت و خوشی سے چہرے دمک رہے تھے کہ قربانی کا کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب ہو گیا۔

رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کی اس ہجرت نے اعلان کر دیا کہ اللہ سب پر مقدم ہے، دین ہر نفع سے قیمتی ہے، عیش و آرام کی پرامن زندگی سے بہتر عقیدہ و ایمان کی خاطر مرجانا ہے، ہجرت نے بتایا کہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

ظلم، باطل اور ذلت کے خلاف جتنی قوت ہو اس قدر بغاوت کرنی چاہیئے اور حسب مقدرت سرکشی و فساد کی سرزمین سے یہ عزم کرکے نکلنا چاہیئے کہ آئندہ ان کے خاتمہ کی تیاری ہمیں کرنی ہے۔

رسول اللہ نے جب حکم خداوندی کا اعلان کیا اور اللہ کی طرف بلایا تو مشرکین بھڑک اٹھے، اور ظلم کے پہاڑ توڑنے لگے، رسول اللہ نے اولاً تو صبر کیا لیکن جب محسوس کیا کہ اس طرح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تو آپ نے ہجرت کے مسئلہ پر کافی غور و فکر کیا۔ اور شاید حبشہ کی طرف جو جعفر بن ابی طالب کے ساتھ صحابہ نے ہجرت کی تھی، وہ ایک عملی تجربہ کے طور پر تھی۔ رسول اللہ نے سرزمین حبشہ کو دارالہجرت نہیں بنایا حالانکہ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی حفاظت کی تھی اور جب مشرکین مکہ مسلم مہاجروں کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے حبشہ گئے تھے تو نجاشی نے منہ توڑ جواب دیکر خائب و خاسر لوٹا دیا تھا لیکن پھر بھی رسول اللہ نے حبشہ کو دارالہجرت اس لئے نہیں بنایا کہ یہ جزیرۃ العرب سے بہت دور تھا اور سلام و پیام کے تعلقات میں بعد مسافت کی وجہ سے دشواری پیش آتی۔

اسی طرح اور دوسرے شہر بھی مرکز دعوت سے دور تھے، مدینہ ہی دارالہجرت بنانے کے لئے سب سے بہتر تھا چنانچہ آپ نے ہجرت کی اور خدا کی توفیق سے ایک اسلامی جماعت وہاں کے لوگوں کی پیدا ہو گئی جس نے رسولؐ اور اسلام کی راہ میں مرمٹنے کا عہد کیا، جان و مال اور ہر چیز سے آپ کی مدد کرنے کا عہد کر لیا۔

رسول اللہ اور صحابہ کرام کی ہجرت مدینہ ایجابی عمل کی طرف پہلا قدم تھا کیونکہ ہجرت نے عالم بشری پر نئے دور کا آغاز کیا۔ ہجرت نے وہ کچھ کیا جو کسی امت اور کسی حکومت نے آج تک نہیں کیا۔ ہجرت کے نتائج اتنے بڑے بڑے ظاہر ہوئے کہ یہ ایک غیر طبعی سی چیز خیال کی جانے لگی، اسباب و وسائل نے مجتمع ہو کر جو نتائج نہیں پیدا کئے وہ اس ہجرت نے پیدا کر دیئے جس کو دیکھ کر چشم عالم حیران ہے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ کا یہ مقصد نہیں ہوا کہ لوگوں کو متحد کرکے مادی منافع کے لئے اپنی قوت کو جھونک دیں جیسا کہ آج کل اقوام عالم کا دستور ہے، بلکہ انسانوں کی انفرادی قلبی و عملی اصلاح و جلا کو مقصد بنایا۔ تاکہ انسانیت بلند ہو اور ایک صالح اجتماعیت کی داغ بیل ڈالی جائے جس کے ہر فرد میں خیر و معروف کی وہ طلب پیدا

ہوجائے کہ ان کی طبیعتیں پولس کے ڈنڈوں کے خوف سے نہیں بلکہ خود بخود منکرات سے بچتی رہیں اور عدل وانصاف بلا تفریق ہر کس وناکس میں پھیل جائے۔

آج کل جو معاملات قوموں میں رائج ہیں یا تاریخ کے مختلف ادوار میں اس طرح کے واقعات کے بعد قوموں میں پیدا ہوجاتے ہیں، ہجرت کے بعد اس طرح کے معاملات اختیار نہیں کئے گئے بلکہ ہجرت کے بعد آداب واخلاق، اصول ومبادی کے انسانیت ساز ایسے نمونے پیش کئے گئے جن کی نظیر قدیم وجدید کسی دور میں اور کسی قوم میں نہیں ملتی۔ یہی سب وجوہات تھے کہ باوجودیکہ انسانیت اپنے عروج کو پہونچ چکی ہے اور آج کا دور بڑا ممتاز کہا جاتا ہے لیکن پھر بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں جو حق وجمال، قوت وآزادی تھی اس کی گرد کو بھی آج تک کوئی حکومت نہیں پہونچ سکی۔ آپ نے دین کو دولت سے الگ نہیں کیا اور نہ روحانیت کو مادیت سے جدا کیا، بلکہ آپ کی حکومت مسجد وبازار کی جامع تھی، بازار میں بھی مناروں سے آواز آنے لگی۔ کہ لوگو! خیر اور عمل صالح کو اختیار کرو اور مسجد میں بھی بازار وتجارت کا یوں ذکر آیا کہ عبادت ایسی تجارت ہے جس کا نفع کبھی ختم ہونے والا نہیں" دین سے دنیاوی استقلال کا پیغام ملا اور نیکوکاروں کے لئے تسخیر عالم کی بشارت ملی تاکہ انسانیت کی خدمت اس طرح انجام دے سکیں۔

ہجرت نے طبقاتی جنگ کا خاتمہ کردیا۔ اسلام طبقات کو ختم نہیں کرتا بلکہ طبقاتی کشمکش کو ختم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے دور عروج میں بادشاہ اور چرواہے بھائی بھائی نظر آنے لگے ان کے دلوں میں محبت تھی اور کینہ ونفرت سے ان کے قلوب پاک تھے۔ ایک نیکوکار بھائی جو محتاج ہوتا اپنے مالدار بھائی سے کوئی کینہ نہیں رکھتا تھا۔ ہجرت کے بعد چشم عالم نے دیکھا کہ جو طبقاتی کشمکش کسی سے ختم نہ ہوسکی وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوفیق الٰہی ختم کردی۔

ہجرت کے نتائج یہ ہوئے کہ مسلمانوں میں ضعف کی جگہ قوت اور انفرادیت کی جگہ اجتماعیت پیدا ہوگئی۔ مشرکین کے خوف سے مسلمان چھپ چھپ کر اپنے فرائض ادا کرتے رہے لیکن ہجرت کے بعد کھل کر اور جماعت کے ساتھ ادا کرنے لگے اور دعوت بھی کھلم کھلا ہونے لگی، کیونکہ ایسے ارکان پیدا ہوگئے جو حملہ آوروں کا ڈٹ مقابلہ کرسکتے تھے ان حالات سے مسلمانوں اور غیر مسلموں سب میں اسلام کی

بابت نئی فکر پیدا ہوگئی۔

مسلمانوں کی نظر میں یہ نئی تبدیلی پیدا ہوئی کہ اپنے دین کو قوت و رحمت، حریت و اخوت، مدارات و مساوات کا دین سمجھنے لگے پہلے عاجز تھے مگر اب اپنی جان، آبرو، عقیدہ اور دین پر سے حملہ آوروں کے حملے دفع کرنے کی قوت محسوس کرنے لگے۔ پہلے بھی رسول پر اور اللہ پر کامل ایمان تھا لیکن مجبوری و ناتوانی نے اسیر استبداد کر رکھا تھا اب توانائی نے حالت بدل دی کہ ظلم و جبر کے خلاف صف آرا ہو کر اعلان کر دیا کہ "عزت مسلمانوں کے لئے ہے مشرکوں کے لئے نہیں" چنانچہ مشرکین کے اخلاق کو سفاہت و دنائت کی چیز کہہ کر اعلان کر دیا کہ تمہارے جھوٹے خدا کی حقیقت ایک مسخرہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

اور مشرکوں میں اسلام کے بارے میں یہ تبدیلی فکر پیدا ہوگئی کہ انھوں نے محسوس کیا کہ محمد صرف جان بچانے کے لئے مکہ سے نہیں بھاگے ہیں بلکہ انھیں ایک ایسی سرزمین درکار تھی جہاں اپنی دعوت کی تخم ریزی کریں اور ان کی دعوت ہر حیثیت سے برگ و بار لائے۔ یہ سوچ کر جس طرح مکہ میں رسول اللہ کے قتل کا ارادہ کیا تھا اسی طرح اب پھر ارادہ کر لیا کہ ان کی دعوت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں انھیں سب سے زیادہ خوف اس سے ہوا کہ پہلے جو لوگ متفرق تھے اب ان میں جماعتی زندگی آگئی ہے اور یہ دین اب پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اپنے اور معبودان باطلہ پر نازل ہونے والی خطرناکیوں کو بھانپ کر قوت جمع کرنے لگے تاکہ ایک دن حملہ کر کے مسلمانوں کا صفایا کر دیں، مشرکین کو دیکھ کر حیرانی ہوتی گئی کہ جو لوگ انتہائی بیکس و کمزور تھے آج اتنے مضبوط و توانا ہوگئے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی بڑی سے بڑی قوت سے بھی نہیں ڈرتے، جب یہ خیال کیا کہ کل کے غلام آج سردار ہوتے جا رہے ہیں اور صنادید قریش سے ان کا سر اونچا ہوتا جا رہا ہے تو معاً یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ خود سری کا مرض ہمارے موجودہ خدام میں نہ سرایت کر جائے اور یہ بھی محمد کے دین کا اتباع کرنے لگیں پھر تو ہمارا خاتمہ ہو جائے گا اور محمد کی تحریک کا مقابلہ کسی کے بس کی بات نہ رہ جائے گی۔ اس طرح کے اندیشے کفار میں ہیجان پیدا کرنے لگے۔

مسلمانوں میں ہجرت نے ایسے ایسے خیالات پیدا کر دیئے جو پہلے کبھی پیدا نہ ہوئے تھے انھوں نے اب محسوس کیا کہ زندگی کا حق صرف رئیس و طاقتور ہی کو نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا یہ حق ہے اور سب

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

برابر کے شریک ہیں۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ خدا کی زمین اس کے صالح بندوں ہی کا حق ہے اور یہ حادثہ کوئی فساد انگیزی نہیں ہے بلکہ یہ توعین اصلاح ہے کیونکہ اس سے صالحین کو سکون خاطر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے، کسی مخلوق، فرشتہ، نبی یا بادشاہ کی بندگی اس کے شایان شان نہیں ہے۔ انسان کے لئے جتنی چیزیں مفید ہیں ان کا حصہ اس کو ملنا چاہئے۔ یہ چیزیں حلال ہیں اور دنیا سے کنارہ کشی کا حکم ایجاد بندہ اور حرام ہے جیسا کہ نبی برحق نے بھی فرمایا ہے لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ اللہ نے اپنے نبی کی زبانی یہ بھی حکم فرمایا کہ "تم قیام کرو سویا کرو، روزے رکھو اور رکھا ڈ، سو انطار کرو، تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے دوستوں کا بھی تم پر حق ہے"

یہ مختصر سے رسول اللہ کے کلمات ہیں مگر ان میں اسلام کی بنیادی چیزیں آگئی ہیں، ان میں آدمی کی نشاط انگیز قوتوں پر قانونی بندش لگا کر زندہ درگور نہیں کیا گیا بلکہ سب کو آزادی دی گئی ہے کہ ان کو بروئے کار لائیں فرمایا لا ضرر ولا ضرار۔

ہجرت کے ذریعہ ایک مضبوط انقلاب کی بنیاد پڑی۔ یہ انفرادی و اجتماعی زندگی اور تصور دین میں ایک انقلاب تھا جس نے بتایا کہ انسان کی دینی زندگی یہ نہیں ہے کہ دنیا اور لذائذ دنیا سے کنارہ کش ہو یا ان پر اتنا فریفتہ ہو کہ اپنی جان چھڑکنے لگے اور آخرت سے منہ موڑ لے، یہ افراط و تفریط دوسرے ادیان میں تھی چنانچہ مسیحیت نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور یہودیت نے آخرت کو پس پشت ڈال دیا۔ ان دونوں افراط و تفریط کو ختم کر کے اسلام نے دنیا و دین کا امتزاج کیا اور دنیاوی کاروبار کے بازار کو مسجد تک ہی نہیں بلکہ جنت تک پہونچنے کی گذرگاہ بنا دیا۔ جاہل بدوؤں میں انسانیت کا وہ مفہوم عام ہو گیا کہ اس سے بہتر مفہوم بڑے بڑے فلاسفہ بھی نہ بتا سکے۔ انسانیت کا مفہوم انھوں نے یہ سمجھا کہ "مسلم بھائی جو چیز اپنے لئے پسند کرے وہی دوسرے کے لئے بھی پسند کرے" اور مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے انسان سلامتی میں رہیں" اور مومن کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھی کہ اس کی غذا بھی عمدہ اور اس کا فضلہ بھی عمدہ"

عقل اور دین میں جنگ چل رہی تھی لیکن اسلام نے ان دونوں میں رفاقت پیدا کر دی چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا لا دین لمن لا عقل لہ جس کے پاس عقل نہیں اس کے پاس دین بھی نہیں قرآن نے عقل کو اونچا مقام دیا اور عقل کے جوہر کو مختلف آیات میں ابھارا۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ دین کے لیے کوئی خاص گروہ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر مسلم کا دین پر حق ہے، اس نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح ہوا اور پانی تمام لوگوں کے لئے عام ہے اسی طرح علم پر بھی کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ سب حقائق ہجرت کے بعد ہجرت کے نتائج کے طور پر آشکار ہوئے۔

ہجرت نے مختلف العقائد لوگوں کو ایک کر کے امت واحدہ پیدا کر دی چنانچہ اسلامی وحدت کے زیر سایہ یہود و نصاریٰ وغیرہ نے بھی اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اپنے مال و اسباب اور جان و آبرو کو محفوظ و مامون پایا۔ مسلمانوں نے ان کے حقوق کی نگہداشت کی۔ اس اسلامی حکومت نے جس طرح مختلف ادیان والوں کے درمیان رواداری کی فضا پیدا کر کے خوشگوار زندگی بخشی اس کی نظیر کسی زمانہ کی کسی حکومت میں نہیں ملتی۔ اور یہ کہہ کر کہ الانسان اخو الانسان "انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں" ایک نظام جدید کی بنیاد رکھی تاکہ دینی، لسانی، لونی اور وطنی اختلاف کے باوجود صلح و آشتی کا علاقہ قائم ہو جائے۔

اسلام نے صرف مسلمانوں ہی کو متحد نہیں کیا اور نہ صرف مسلمانوں کے لئے امن کی ضمانت لی بلکہ ہر انسان کے لئے اس وقت تک الفت و امن کا پیغام مسرت سنایا جب تک وہ انسان از خود کسی کی آزادی و حقوق پر دست اندازی نہ کرے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ مدینہ یہود و نصارے اور منافقین و مشرکین کا بھی وطن تھا اور اسلام نے ان کو اذیت پہونچائی ہو یا ان کے حقوق ادا نہ کئے ہوں ایسا کبھی نہیں ہوا۔

یہ سب مثبت کام تھے جو ہجرت کے نتائج کے طور پر خدا نے رسول کے لئے مقدر فرمادئے تھے مدینہ میں آکر منفی اور مدافعانہ امور میں مشغولیت کے بجائے تشریع و تبلیغ کے اثباتی امور کو اختیار کیا گیا چنانچہ یہیں سے شکست کے بجائے فتح اور رنج و بے چینی کے بجائے اطمینان و راحت کے خطوط

کھینچ گئے۔ اور رسول اللہ کے لئے اس سکون کی زندگی میں یہ فرصت ملی کہ آپ انسانیت کے حال پر خوب غور و فکر کر کے اس کے تمدن اور وحدت و اجتماعیت کا سنگ بنیاد رکھیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ہجرت کے سبب انفرادیت کی تنگ و محدود زندگی سے اجتماعیت کی وسیع و پائدار زندگی کی طرف قدم بڑھایا گیا۔

ہجرت سے قبل مسلمان الگ الگ تھے کوئی جماعتی زندگی نہ تھی اگرچہ اس وحدت میں بھی ہر ہر فرد ایک جماعت کی قوت اپنے میں محسوس کرتا تھا مگر اشتراک و اجتماع نہ تھا۔ رسول اللہ نے اس عالم بیکسی میں جب یاسرؓ اور ان کی بیوی اور ان کے بیٹے کو دیکھا کہ اللہ کی راہ میں بڑی سخت تکلیف میں مبتلا کئے جا رہے ہیں تو آپ کے غم و اندوہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود آپ ان کو نجات دلانے کی قوت نہیں رکھتے تھے کیونکہ آپ ایک بڑے گروہ کے مقابل تن تنہا ہے اس وقت آپ نے یاسرؓ کی اذیتوں کو دیکھ کر بس یہ فرمایا:- اصبروا یا آل یاسر فان موعدکم الجنۃ " اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہے"۔

چونکہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کا ہر فرد غیر متحد تھا اس لئے باوجودیکہ ہر فرد اپنی جگہ بہادر تھا لیکن کفار کے گروہ کے استبداد و جور سے دو چار ہوتا رہا اور اس کے مناع سے عاجز و معذور رہا۔ اس انفرادیت کی وجہ سے کفار کی بن گئی اور مسلمانوں کو اکا دکا پکڑ کر مارنے قتل کرنے اور ستانے میں کامیاب ہوتے رہے۔ قریش نے بھی ان کو فرصت نہ دی کہ یہ مظلوم لوگ ایک جماعت کی شکل اختیار کریں۔ چنانچہ قریش نے حتی الامکان کوشش یہی کی کہ مسلمان الگ الگ رہیں تاکہ ہم ان کو ستاتے رہیں اور وہ ہمارے خلاف اٹھ کر کامیاب نہ ہو سکیں۔

لیکن ہجرت نے نقشہ بدل دیا۔ اب تمام مسلمان ایک امت بن کر امت کفر کے مقابل ڈٹ گئے۔ قوتوں میں ٹکراؤ ہوا تو اگرچہ مشرکوں کی قوت کئی گنا زیادہ تھی لیکن مسلمانوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب ہم ایک متحدہ قوت ہو گئے ہیں۔ ہم فکر و عقیدہ اور قوت میں متحد ہیں اس احساس نے ان کی قوت میں اور اضافہ کر دیا اور مسلمان کافروں پر غالب آ گئے۔

مدینہ میں مسلمانوں کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ ہم قوت واحدہ ہو گئے ہیں تو زمانے

کی تلخیوں سے لڑنے کی تڑپ پیدا ہوگئی اور اب یہ لوگ مکمل کر جماعت سے نمازیں پڑھنے لگے اور نئی نئی تکالیف کا سامنا کرتے آگے بڑھتے رہے اتحاد نے سب کچھ جھیل لیا اور نئی حکومت کی بنیاد قائم کرنے کے لئے قدم آگے بڑھنے لگے۔

رسول اللہ فرائض کے علاوہ جس طرح ممکن اور آسان امر کو اختیار فرمایا کرتے تھے اسی طرح ہجرت کے بعد نئی زندگی میں مسلمانوں کے لئے آسانی ممکن کو پسند فرمایا اور اتنا بوجھ نہیں لاد دیا کہ وہ سہار نہ سکیں۔ چنانچہ آپ نے خاکہ حکومت بنایا اس کے ستون مضبوط کئے۔ آپ نے اس تعمیر میں اپنی شخصی تاثیرات چھوڑیں اور ہر شخص نے اعتراف کیا کہ آپ ہی اس حکومت کے بانی ہیں تمام مسلمان بھی اس تعمیر کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ عالم انسانیت میں اس تعمیر حکومت نے ایسے قیمتی نمونے پیش کئے کہ تاریخ انسانی میں آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔

رسول اللہ نے مسلمانوں کو آگے بڑھانے میں تدریجی رفتار اختیار فرمائی تاکہ یک بیک بوجھ نہ پڑجائے پس فرد سے جماعت تک پہونچایا پھر جماعت سے امت تک پہونچایا اور پھر امت سے پوری انسانیت کی طرف لے گئے۔

میرا اعتقاد ہے کہ رسول اللہ کے ساتھیوں میں ایسے ایسے افراد تھے مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان، علی، خالد، زبیر ابن عوف، طلحہ، حسن، حسین، فاطمہ، عائشہ، حفصہ وغیرہم رضوان اللہ علیہم کہ ان کی نظیر نہ مسلمانوں میں مل سکتی ہے نہ غیروں میں، یہ سب ہجرت ہی کے برگ و بار تھے۔

ان لوگوں کی راہ میں بڑی بڑی مشکلات آئیں لیکن اسلام نے اپنی فطری قوت ان کے اندر بھر دی جس کے ذریعہ یہ لوگ کامیاب ہوئے۔ دعوت اسلامی اور ثقافت دینی کو فروغ ہوتا گیا۔ نئی نئی فکر و عقل اور نئے نئے نفوس سلیمہ کی نشوونما ہوتی گئی بالآخر اسلام کا ایک بلند تمدن اور پاکیزہ معاشرہ ظہور پذیر ہوگیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مسلمان ایک ایسی امت ہو چکے ہیں جس میں مسلح دشمنوں سے مقابلہ کی قوت بھی آگئی ہے تو اب زندگی کے دوسرے امور کی تنظیم شروع کر دی۔ چنانچہ قریش سے تجارتی و اقتصادی تعلقات منقطع کر لئے اس انقطاع نے مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کر دی لیکن قریش کے مالی اقتصادی اور سیاسی نظام کی بنیاد ہل گئی، درآمد و برآمد کی راہ تنگ ہوگئی۔ قبائل میں قریش کی شہرت و سرداری

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

بھی ختم ہونے لگی اور انسانوں کی غلامی، جور و ظلم اور فساد کا خاتمہ ہوتا گیا۔

ہجرت کے عظیم نتائج میں سے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ اسی نے دین کا ستون گہرائی میں گاڑ کر فتح مکہ کے بعد سرزمین قبلہ کو شرک اور بتوں سے پاک کیا گویا ہجرت عروج اسلام اور زوال کفر کا پیش خیمہ تھا، ہجرت نے مسلمانوں کو ایک ایسی امت بنا دیا جس نے انسانوں کو مقدس اور بلند پیغام حیات دیا۔ ایک ایسی تہذیب دی جو الحاد و ضلالت کی آلائشوں سے مبرا تھی اسی تہذیب کو لے کر اطراف عالم میں پہونچے اور پستی سے دنیا کو نجات دلائی۔ اور درحقیقت ہجرت اپنے نتائج کے اعتبار سے اس وقت تک ناتمام رہتی، اگر اسلام ایک حقیقت بن کر لوگوں کی آنکھوں کے سامنے نہ آجاتا۔ لیکن اسلام روحانی، مادی جنگی، اقتصادی اور تمدنی ہر حیثیت سے ایک حقیقت مشہودہ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔

آج ہی کی طرح ان دنوں دو بڑی قوتیں دنیا میں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں۔ ایک مشرق کی قوت تھی جس کی نمایندگی فارس کر رہا تھا اور دوسری مغرب کی قوت تھی جس کا نمایندہ روم تھا اسلام ان دونوں کے درمیان کود پڑا یہ ان میں سے کسی سے بھی راضی نہ ہوا کیونکہ اہل فارس لا دینیت کی طرف جا رہے تھے اور روم مغربی استعماریت کی طرف۔ ہاں اسلام کا ذرا سا جھکاؤ روم کی طرف تھا یہ اسلئے نہیں کہ اسلام نے روم کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا بلکہ محض اس لئے کہ ان کا شر بہ نسبت فارس کے کم تھا، یہ جھکاؤ مصلحتاً تھا لیکن جب اسلام کی بنیاد مضبوط ہو گئی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جزیرۃ العرب میں پھیل کر باہر ممالک میں بھی اپنی کرنیں پہونچانے لگا۔ تو آپ کی دعوت فارس و روم دونوں کی طرف متوجہ ہوئی، فارس نے ازراہ تکبر سرکشی کی اور روم کو یہ دعوت اچھی لگی لیکن اس نے بھی اس کی پیروی نہیں کی اسلام نے جب دیکھا کہ یہ دونوں کیمپ اللہ سے منہ موڑ کر کفر و فساد میں مشغول ہیں تو ان دونوں قوتوں پر بیک وقت کاری ضرب لگائی، اس اقدام کا مقصد ریاست و سرداری حاصل کرنا نہ تھا بلکہ اللہ کی راہ پر لگانا مقصد تھا۔ اس ضرب کے بعد ان دونوں قوتوں کی کمر ٹوٹ گئی اور چند سالوں کے بعد یہ قوتیں جسد بے روح ہو کر رہ گئیں۔

مسلمانان عالم سے میرا خطاب ہے، اے مسلمانو! ہم ہی اس وقت تھے اور آج بھی وہی ہم ہیں۔

باقی ص ۱۶۴ پر

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

غزوۂ خندق کا ترانہ

خندق کے دن مہاجرین و انصار کے چہرے بھوک اور کثرت کار سے اترے ہوئے دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا :۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَہْ فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُہَاجِرَہْ

اے اللہ! انصار و مہاجرین کو بخش دے اور انہیں اخروی عیش نصیب فرما آخرت ہی کا عیش درحقیقت عیش ہے

رسول اللہ کے اس دعائیہ کلام پر صحابہؓ نے جواب دیا :۔

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْجِہَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

محمدؐ سے ہم نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک ہم زندہ رہیں گے اللہ کی راہ میں ہر مصیبت و تکلیف جھیلتے رہیں گے

خندق کھودی جارہی تھی اللہ کے رسول بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ مل کر مٹی اٹھا رہے تھے۔ آپ کا بدن مٹی سے اٹا ہوا تھا اور آپ یہ ترانہ بآواز بلند دہرا رہے تھے :۔

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

اللہ کی قسم اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو ہم راہ راست پا سکتے نہ صلوٰت و صدقات کی توفیق ہوتی

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا

اے خدا! ہمیں اطمینان نصیب فرما اور اگر دشمنان دین سے مقابلہ ہو تو ہمارے قدم جما دے

اِنَّ الْاُوْلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا وَاِنْ اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

ان اعدائے دین نے ہم پر چڑھائی کی ہے اگر ان کا یہ مقصد ہے کہ ہمارے عقیدے میں بگاڑ پیدا کریں تو ہم انکار کرتے ہیں

اَبَیْنَا ۔ اَبَیْنَا

ہم انکار کرتے ہیں ، ہم انکار کرتے ہیں

غزوۂ حنین کا کلام

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

یہ بالکل سچ ہے کہ میں اللہ کا نبی اور عبدالمطلب کی اولاد سے ہوں

تیرے بغیر

ماہر القادری

زندگی کچھ بھی نہیں تیری محبت کے بغیر
اور بے روح محبت ہے اطاعت کے بغیر
کوئی دستور مکمل، نہ کوئی نظم درست
تیرے لائے ہوئے آئین شریعت کے بغیر
دین ہی میں کوئی لذت ہے نہ دنیا میں ہے لطف
اے غم عشق نبی! تیری رفاقت کے بغیر
ساغر آب حیات آئے تو میں ٹھکرا دوں
بخدا نام محمدؐ کی حلاوت کے بغیر

زندگی نام ہے کونین پہ چھا جانے کا
برف کی قاش ہے دل جوش عزیمت کے بغیر
رہرو راہ صداقت! تجھے معلوم رہے
راہ یہ طے نہیں ہوتی ہے مصیبت کے بغیر
اس طرح سوئے ہیں ارباب وفا چین کی نیند
جیسے اٹھیں گے نہ یہ شور قیامت کے بغیر
مرحبا سنت سردار دو عالمؐ کے طفیل
آن پہونچا ہوں کہاں کشف و کرامت کے بغیر

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم

تاج الدین اشعر رام نگری

الٹ کر ذرا پچھلے اوراق چودہ، مرے ہم نشیں پڑھ کتابِ زمانہ
وہ انساں کی تاریخ کا عہدِ رفتہ جو ہے ایک اندوہ آگیں فسانہ
عرب، مصر، یونان و چیں، ہند و فارس تمدن تھا ہر ایک کا جاہلانہ
کہیں شمعِ عرفاں روشن نہیں تھی، یہ دنیا تھی یا تیرگی کا خزانہ

خصوصاً عرب کا وہ تاریک خطہ، جو وحشت کا مرکز، جہالت کا گھر تھا
معرّیٰ تھا تہذیب و شائستگی سے، تمدن سے ناآشنا سر بسر تھا
یہ آدم خدا کا مکرم خلیفہ، خود اپنے مقامات سے بے خبر تھا
پرستش کی شایاں تھی ہر شے جہاں کی، پرستار تھا کوئی تو وہ بشر تھا

وہ کعبہ، براہیمؑ کی وہ نشانی، جو دنیا میں مرکز تھا توحیدِ رب کا
مرورِ زمانہ کی نیرنگیوں سے، بنا آستانہ بتانِ عرب کا
خدائی کے مالک تھے پتھر کے ٹکڑے وہی رزق تقسیم کرتے تھے سب کا
رضا ان کی ضامن تھی عیش و خوشی کی غضب ان کا باعث تھا رنج و تعب کا

خدا کو بھلائی ہوئی تھی خدائی، پرستارِ اصنام تھا بچہ بچہ
حقائق کی جانب سے تھیں بند آنکھیں گرفتارِ اوہام تھا بچہ بچہ
بہت عام تھا ذوق بادہ کشی کا، شرابِ مے و جام تھا بچہ بچہ
کسی کو بھی کھٹکا نہ تھا عاقبت کا کہ بے فکرِ انجام تھا بچہ بچہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

زمانے میں باطل سے مغلوب تھا حق، یہاں خیر پر بھی تھی شر کی خدائی
تھی محنت پہ سرمائے کی حکمرانی، غریبوں پہ تھی اہلِ زر کی خدائی
غلاموں پہ آقاؤں کا تھا تسلط، ضعیفوں پہ تھی زور ور کی خدائی
غرض یہ کہ پورب سے پچھم تلک تھی بشر پر مسلط بشر کی خدائی

اچانک ہوا چاک دامانِ ظلمت، کہ فاراں سے اک سیلِ انوار اٹھا
خدا کا حقیقی پرستار اٹھا، خدائی کا سب لوٹ غم خوار اٹھا
حرا کے پراسرار خلوت کدے سے لئے ایک شمع ضیا بار اٹھا
لئے اپنے سینے میں انسانیت کا بڑا درد اٹھا، بہت پیار اٹھا

جو صدیوں سے تھے خفتۂ خوابِ غفلت انھیں وہ ندا پہ ندا دے رہا تھا
جو تھے جاں بلب شدتِ تشنگی سے انھیں جامِ آبِ بقا دے رہا تھا
خدا کا نبی اور خدائی کا ہادی جہاں کو پیامِ خدا دے رہا تھا
صفا پر کھڑا تھا، خدا کا منادی، زمانے کو حق کی صدا دے رہا تھا

زمانے کے اوپر ہوا فضلِ باری، بہاروں کا پیغام لائیں ہوائیں
دلوں کی جھلستی ہوئی کھیتیوں پر برسنے لگیں رحمتوں کی گھٹائیں
زمیں بن گئی مخزنِ نور و نغمہ، سہانی ہوئیں دو جہاں کی فضائیں
بہر سمت امصار و دشت و دمن میں لگیں گونجنے لا الٰہ کی صدائیں

وہ مکہ کا امی نبیؐ تھا کہ جس نے بنی نوعِ انساں کی حالت بدل دی
دماغوں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا کہ وحشی درندوں کی فطرت بدل دی
نظامِ تمدن ہوا پست و بالا سیاست بدل دی، حکومت بدل دی
فقیروں کو بخشا شکوہِ جم و کے، غلاموں کی مجبور قسمت بدل دی

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

زمانے کی وحشت بھری تیرگی میں چراغِ ہدیٰ کا اجالا پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم
وہ مکہ کا ہیرو، وہ طائف کا مہماں، وہ باحوصلہ، وہ جیالا پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم
ہمیشہ رضائے الٰہی کا جویا، مشیت کی گودی کا پالا پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم
زمانہ جبینِ عقیدت جھکا کر جسے کہتی ہے کملی والا پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کھجوروں کے چھپر کے حجرے کا باسی، چٹائی پہ راتیں بسر کرنے والا
شہنشاہِ کون و مکاں اور پھر بھی سدا نانِ جو پر گذر کرنے والا
ضلالت زدہ نوعِ انساں کے غم میں پھلی کو اشکوں سے تر کرنے والا
خدا کے گنہ گار بندوں کی خاطر دعاؤں میں روز و سحر کرنے والا

پڑا حق پہ جب بھی کٹھن وقت کوئی وہ نکلا عساکر کا سالار بن کر
رہا کار زارِ حنین و احد میں کھڑا استقامت کی دیوار بن کر
شب و روز فاقوں میں خندق کنی کی، دو عالم کا آقا و مختار بن کر
گرا تو گرا ابن کے ایماں کی بجلی اٹھا تو اٹھا حق کی تلوار بن کر

حقیقی مساوات گر دیکھنی ہے تو آ در محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار دیکھو
ابوبکرؓ و عثمانؓ کے پہلو بہ پہلو یہ بیٹھے ہیں خبابؓ و عمارؓ دیکھو
مقامِ صہیبؓ و بلالؓ اللہ اللہ! غلاموں کو مخدومِ احرار دیکھو
یہ جمہوریت کا دل افروز منظر ان آنکھوں کو مل مل کے سو بار دیکھو

مواخات کی بزم آراستہ ہے یہ دیکھو مہاجر یہ انصار دیکھو
نگاہوں میں امنڈی ہوئی یہ محبت دلوں میں چھلکتا ہوا پیار دیکھو
ہر اک نے ہر اک چیز تقسیم کر دی، یہ اخلاص و الفت یہ ایثار دیکھو
اخوت کی مدح و ثنا پڑھنے والو! ذرا یہ اخوت کا معیار دیکھو

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

نگاہ مہر و مہر حیراں ہے ابتک، زمانے میں کیا انقلاب آگیا تھا
بدی ڈھونڈتی پھر رہی تھی پناہیں گناہوں پہ سیل عذاب آگیا تھا
نکھرنے لگا روپ انسانیت کا، عجب نیکیوں پر شباب آگیا تھا
وہ عالم تھا جیسے خدا کی زمیں پر خدا کا کرم بے نقاب آگیا تھا

دھڑکتا تھا جو سینۂ مصطفیٰ میں وہ دل، ہائے اس دل کی قیمت نہ پوچھو
کبھی فرش پر تھی کبھی عرش پر تھی، علوئے نگاہِ رسالت نہ پوچھو
محمد کی سیرت ہے قرآن سارا، اسے دیکھ لو، انکی سیرت نہ پوچھو
وہ انسان کامل تھے انسان کامل اس انسان کامل کی عظمت نہ پوچھو

جسے عالمی امن کہتی ہے دنیا وہ انساں کا بھولا ہوا خواب ہے پھر
دلوں کا سکوں اور روحوں کی راحت زمانے میں ایک جنس نایاب ہے پھر
حکومت انساں کی تالاں ہے انساں بہت مضطرب و بیتاب ہے پھر
یہ عالم ہے بے چین انسانیت کا کہ مانند ماہیِ بے آب ہے پھر

زمانے کے دانشورو سربراہو! اٹھو اور سمجھو مقام محمد صلی اللہ علیہ وسلم
زمانے نے گو کروٹیں لاکھ بدلیں ہے تازہ ابھی تک پیام محمد صلی اللہ علیہ وسلم
چلے آؤ اس یثربی میکدے میں کہ ابتک ہے گردش میں جام محمد صلی اللہ علیہ وسلم
تمہیں عالمی امن کی جستجو ہے تو برپا کرو پھر نظام محمد صلی اللہ علیہ وسلم

زمانے کی محفل کو جس نے سنوارا، ہزاروں سلام اس مقدس نبی پر
جسے حق نے محبوب کہہ کر پکارا، ہزاروں سلام اس مقدس نبی پر
وہ پستوں کو پستی سے جس نے ابھارا ہزاروں سلام اس مقدس نبی پر
جو ٹوٹے دلوں کا ہے تنہا سہارا ہزاروں سلام اس مقدس نبی پر

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

درود وسلام

ابوالمجاہد زاہد

شفیعِ محشر، قسیمِ کوثر، درود تم پر ، سلام تم پر
ہمارے ہادی، ہمارے سرور درود تم پر سلام تم پر

خلوص ومہر و وفا کے خوگر، درود تم پر سلام تم پر
عطائے فقر و غنا کے پیکر ، درود تم پر سلام تم پر

کمالِ انساں، جمالِ قرآں، کتابِ ناطق، رسولِ صادق
نبی خاتم، حبیبِ داور ، درود تم پر سلام تم پر

سحابِ رحمت، ہمہ رسالت، ہمہ صداقت، ہمہ امانت
طبیبِ اطہر، منور النور ، درود تم پر سلام تم پر

کرم کی یہ شان یہ نوازش جنہوں نے کی پتھروں کی بارش
دیئے انہیں کو یقیں کے گوہر، درود تم پر سلام تم پر

وہ کم نگاہانِ فتنہ پرور، جو خار لگاتے تھے رہ گذر پر
لٹائے رحمت کے پھول ان پر درود تم پر سلام تم پر

پیامِ امن وسلام لائے، مکمل اکمل نظام لائے
حیات کا جاگ اٹھا مقدر درود تم پر سلام تم پر

ذلیل تھی چار سمت عورت اُسے عطا کی (زہے عنایت)
نقابِ عفت، حیا کی چادر، درود تم پر سلام تم پر

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

دلائے سارے حقوق نسواں، لیا یتیموں کو زیرِ داماں،
الم نصیبوں کے یار و یاور، درود تم پر سلام تم پر

ذکور و نسواں، شباب و صبیاں، غلام و آقا، فقیر و سلطاں
سبھی پہ لطف و کرم برابر، درود تم پر سلام تم پر

صدیقِ محسن، رفیقِ دانا، کریم بھائی، رحیم نانا
شفیق والد، خلیق شوہر درود تم پر سلام تم پر

معلم و مصلح و مبشر، مبلغ و مرسل و منذر
حکیم، عارف، نصیر، انصر، درود تم پر سلام تم پر

سبق مساوات کا پڑھا کر، غرورِ نسل و وطن مٹا کر
بدل دیئے زندگی کے تیور، درود تم پر سلام تم پر

چراغ عشق و یقیں جلائے دلوں کی تاریک بستیوں میں
کیا جنوں کو خرد کا رہبر، درود تم پر سلام تم پر

نہ عشرت و عیش کی تمنا نہ عز و جاہ جہاں کا سودا
تمہارے غم پر یہ سب نچھاور درود تم پر سلام تم پر

عمر، ابوبکر اور عثماں، علی و طلحہ، بلال و سلماں
تمہارے پرتو سے سب منور، درود تم پر سلام تم پر

محمد، احمد، حمید، حامد، شہید، شاہد، سعید، زاہد
نذیر، منذر، مطہر، اطہر درود تم پر سلام تم پر

مشعل

اختر بستوی

آج دنیا میں جدھر دیکھئے تاریکی ہے
ظلم ہے جبر ہے مجبوری و مظلومی ہے
امن کے واسطے ہر ملک میں خونریزی ہے
نظم کے نام پہ ہر قوم میں بدنظمی ہے

ذہن مسموم ہیں افکار میں ویرانی ہے
جسم محکوم ہیں اور روح پہ پابندی ہے

ہر طرف پھیلے ہیں دولت کے سنہرے پھندے
ہر جگہ بستے ہیں اغراض و ہوس کے بندے
سب کے افکار پراگندہ ارادے گندے
ماؤں اور بہنوں کی عصمت کے چھپے دھندے

پیار کی قدر نہیں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
پاس تقدیس نہیں شرم و حیا کچھ بھی نہیں

عقل کی راہ میں روشن ہیں توہم کے چراغ
فکر کے ماتھے پہ رخشندہ ہیں الحاد کے داغ
حسن اصنام خیالی کے فدائی ہیں دماغ
ڈھونڈنے سے نہیں ملتا ہے صداقت کا سراغ

حق ہوا بند کتابوں میں روایت ہو کر
زندگی رہ گئی اس دور میں لعنت ہو کر

ہر گھڑی تیز ہوئی جاتی ہے اوہام کی لو
دن بدن ماند ہوئی جاتی ہے ایمان کی ضو
جانے کن ہاتھوں سے بیٹے گی زمانے کی یہ رو
جانے کس سمت سے پھوٹے گی نئی صبح کی پو

آج طوفان کے ماروں کو ہے ساحل کی تلاش
یعنی انسان کو ہے اک رہبر کامل کی تلاش

اے نقیبانِ حرم حسن شناسانِ بہار
تم سے ہی ٹوٹے گا دنیا کے اندھیرے کا حصار
تم ہی کر سکتے ہو سوئی ہوئی روحیں بیدار
تم جو چاہوگے تو مٹ جائینگے سارے آزار

تم نے ہر دور میں انسان کو انسان کیا
مشکلِ دہر کو ہر گام پہ آسان کیا

اٹھو اس دور کی مشکل کا بھی اک حل لیکر
ساری دنیا کے لئے دعوتِ اکمل لیکر
مشعلِ سیرتِ انسانِ مکمل لیکر
یعنی نورِ نگہِ احمدِ مرسل صلی اللہ علیہ وسلم لیکر

یہ وہ مشعل ہے جسے دہر کا حاصل کہئے
دشمنِ ظلمتِ بتخانۂ باطل کہئے

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

لالۂ صحرا

عشرت فرج قادری

ربود عقل و خرد عشقِ بلا فگن جنوں افزا
چراغ افروختہ اندر سینہ ام آں لالۂ صحرا

وہ لالہ جس کی نزہت پر بہار و جہاں صدقے
وہ لالہ جس کی خوشبو سے زمیں مہکی فلک مہکا

وہ لالہ جس کی سرخی ہے فروغِ چشم خوں افشاں
وہ لالہ جس کی گرمی ہے تپش تاب دلِ بینا

وہ لالہ جس کی شادابی سے شادابی دلِ جاں کی
وہ لالہ جس کی رنگت سے طلسمِ رنگ و بو ٹوٹا

وہ لالہ جس کی لالی نے جگر میں آگ پیدا کی
خنک دل جل کے سینے میں ہوا آتش کا پرکالا

وہ آتش نیستاں میں جا کے بھڑکی بے اماں ہو کر
جلا کر خاک کر کے نیستاں کو پاک کر ڈالا

وہ لالہ جس کی نمناکی سے آنکھوں میں نمی آئی
وہ لالہ جس کی خونریزی سے میرا کالبد چمکا

فروغ مہر میں تاروں کی صورت کس نے دیکھی ہے
چمن بھر میں وہ جانِ گل نظر آیا مجھے تنہا

وہ لالہ سرزمینِ غیر ذی زرع کی زیبائش
جمالِ کعبہ و نورِ فروغِ وادیِ بطحا

وہ فخرِ عرشی و فرشی وہ نازِ رومی و حبشی
وہ جانِ طیب و طاہر وہ روحِ حیدر و زہرا

ہزاروں آئینے تھے جن میں صورت دیکھ پاتے تھے
حقیقت دیکھ لی جس میں ملا وہ طرفہ آئینا

وہ آئینہ تجلی نورِ حق کی جس کے گوشوں میں
دلِ مومن ہے جس کی تابشوں سے آئینہ سیما

سراسر شفقت و رافت، سراپا رحمتِ عالم
افق تابِ عرب، نورِ حقیقت، سر بسر جلوا

جنونِ شوق نے آنکھوں کے پردے چاک کر ڈالے
ہوا حاصل مجھے دنیائے بوقلموں سے استغنا

کدھر جاؤں میں ان قدموں سے اٹھ کر آپ ہی کہہ دیں
مرے ملجا مرے ہادی مرے مولیٰ مرے آقا

انہیں قدموں نے بخشی آسمانوں پہ مجھے رفعت
بڑھایا عرشیانِ قدس سے زیادہ مرا رتبہ

خودی کی آنچ نے کندن بنا کر اتنی تابش دی
فرشتے بھی لگا سکتے نہیں قیمت کا اندازا

مرے دل میں تری تعلیم سے اے سرورِ عالم
نئے انوار ہیں ظاہر نئے انداز ہیں پیدا

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

دماغ بستہ و مفلوج کی گرہیں کھلیں اس سے　　نئے رستے ملے ظاہر نئی دانش، نیا معنی
شراب لا کے لاکھوں میکدے ہر گام پر وا تھے　　مگر ساغر نے تیرے بخشدی مجھ کو مئے اِلّا
نگاہوں سے کسی نے صاف کردی گردِ غیریت　　یہاں جلوہ، وہاں جلوہ، اِدھر جلوہ، اُدھر جلوہ
حقیقت مثلِ تیغِ برہنہ روشن ہوئی مجھ پر　　نہ مانع ہے کوئی پردا نہ باقی ہے کوئی رشتہ
مری دنیا وہ دنیا ہے جہاں میں بھی نہیں ظاہر　　نہ چرخ نیلگوں اس میں نہ ثابت ہے نہ سیارہ
نہ حشر آشوب بت ہائے مجازی کا ہے دخل یاں　　نہ جھگڑے ہیں من و تو کے نہ بے معنی کوئی غوغا
جہاں ہر دم حضوری میں نئی فردِ عمل حاضر　　جہاں ہر لمحہ ہوتی ہے قیامت اک نئی برپا
مزا یہ ہے کہ چھپ جاتا ہے تھوڑی دیر آنکھوں سے　　مزا یہ ہے جدھر دیکھو اسی کا نور ہے پیدا
محیطِ کل جہانِ لم یزل، نورِ ازل جس میں　　یہ عرش و فرش و کرسی و ملائک سب ہیں ناپیدا
وہ مالک ہے میں بندہ ہوں رضا اسکی رضا میری　　اسی کی بندگی طرّہ ہے میرے تاجِ عزت کا

حضورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا مظہر الدین

اے شاہِ امم! سرورِ دیں! جانِ دو عالم　　قرباں نگہِ ناز کے ایمانِ دو عالم
گیسو ہیں ترے سورۂ والّلیل کی تفسیر　　عارض ہے ترا مطلعِ دیوانِ دو عالم
لب ہائے مبارک ہیں شفاعت کے پیامی　　چشمانِ مبارک ہیں نگہبانِ دو عالم
جبریل ترے انجمنِ ناز کا قاصد　　کاشانہ ترا زینتِ ایوانِ دو عالم
مشتاق ترے نصرتِ داؤد و سلیماں　　دربار ترا حلقۂ خوبانِ دو عالم
اصحاب ترے حنفا و بے زر و ساماں　　خدام ترے قیصر و خاقانِ دو عالم
فردوس ترے کوچۂ دل آویز کا پرتو　　نقشہ تری گلیوں کا دبستانِ دو عالم
محشر ترے اعجازِ شفاعت کا کرشمہ　　اک موجِ تبسم تری غفرانِ دو عالم
سمٹی ہے ترے سامنے کونین کی وسعت　　پھیلا ہے ترے سامنے دامانِ دو عالم
اے رحمتِ کل مرجعِ خاصانِ دو عالم　　اے یوسفِ کونین سلیمانِ دو عالم
کیا عرض کروں طاقتِ گفتار نہیں ہے　　سلطانِ امم! جرأتِ اظہار نہیں ہے

رحمۃ اللعالمین

عامر عثمانی

بڑی مشکل یہ ہے جب لب پہ تیرا ذکر آتا ہے
دماغ و دل میں اک خوابیدہ محشر جاگ جاتا ہے

ابل پڑتے ہیں سوتے بیکراں جذب محبت کے
ابھر آتے ہیں خاکے تیری صورت تیری سیرت کے

کبھی جی چاہتا ہے تیری معصومی کے گن گاؤں
کبھی جی چاہتا ہے سادگی کا ذکر کر ڈالوں

کبھی کہتا ہے دل زہد و ورع سے ابتدا کر لو
کبھی کہتا ہے دل دریا دلی کا تذکرہ کر لوں

کبھی ذکر جمال دل نشیں پر جی مچلتا ہے
کبھی عہد رسالت شوق کے سانچے میں ڈھلتا ہے

کبھی قصہ سنانا چاہتا ہوں تیرے بچپن کا
بہت سادہ بہت معصوم سنجیدہ لڑکپن کا

کبھی حیرت فزا عزوات پھر جاتے ہیں آنکھوں میں
حنین و بدر کے دن رات پھر جاتے ہیں آنکھوں میں

کبھی تیری صداقت ولولہ انگیز ہوتی ہے
کبھی تیری رواداری تحیر خیز ہوتی ہے

کبھی تیرے کمال صبر پر دل وجد کرتا ہے
تخیل میں ترے اوصاف کا پرچم ابھرتا ہے

کبھی تیری جفاکوشی پہ آنکھیں ڈبڈباتی ہیں
تصور سے ترے فاقوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں

کبھی جلوے ابھرتے ہیں تری مہماں نوازی کے
یتیموں بے سہاروں بیکسوں کی چارہ سازی کے

مسلسل کشمکش ہوتی ہے الفاظ و معانی میں
میں بہہ جاتا ہوں اک خاموش طوفاں کی روانی میں

کہوں کیا کس طرح؟ یہ فیصلہ مجھ سے نہیں ہوتا
خود اپنی الجھنوں کا تجزیہ مجھ سے نہیں ہوتا

سیرت کا موضوع ابھی تشنہ ہے

مولانا خالد انصاری مصنف اجتہاد

ضبط کر دل میں کب تک آہ
چل مرے خامہ بسم اللہ

ماہ ربیع الاول آگیا۔ اور وفات نبوی سے تقریباً ۱۳۶۸ سال سے یہ پیہم آرہا ہے۔ اور تا بہ قیامت آتا رہے گا۔ یہ مہینہ مسلم قوم کے لئے خوشیوں کی بہار ہے۔ صرف اس لئے کہ اس مہینے میں دنیا کی خزاں ضلالت ختم ہوگئی تھی اور بہار حق کا موسم ربیع شروع ہوا تھا پھر اگر آج دنیا کی ضلالت مسموم جھونکوں سے مرجھا گئی ہے تو اے غفلت پرست قوم تجھے کیا ہوگیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم کی تو تمنا ہے۔ مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون

"وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا کی سعادت کے قیام اور ضلالت کی مقہوریت کے لئے، دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ تمام دینوں پر اسے غالب کردے، اگرچہ مشرکوں پر ایسا ہونا بہت ہی شاق کیوں نہ ہو۔"

اس مہینہ کی خوشیاں اس لئے نہیں کہ اسی مہینہ میں اللہ کی عدالت وہ رحمت عالم شریعت کو فاران سے نمودار ہوئی جس کی انبیاء سابقین خبر دے چکے تھے۔ اور وہ دنیا میں مظلوموں کے آنسو بہانے، مسکینی کی آہیں بھرنے، ذلت و نامرادی سے ٹھکرائے جانے کے لئے دنیا میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس لئے آئی تھی تاکہ خدا اور اس کے رسول کے دشمن ذلت و ناکامی سے آنسو بہائیں۔ دشمنان دین الٰہی مسکینی و رسوائی کے لئے چھوڑ دیئے جائیں۔ ضلالت و شقاوت، ناکامی و نامرادی کی ذلت سے ٹھوکریں کھاتے رہیں۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون نحن اولياؤكم في الحيوة الدنيا وفي الاخرة ولكم فيها ما تشتهي انفسكم ولكم فيها ما تدعون نزلا من غفور رحيم۔

خدا کے وہ صالح بندے (جنہوں نے دنیا کی تمام باطل طاقتوں سے کٹ کر) یہ کہا کہ خدا ہی ہمارا رب ہے (اور اس کے

سوا کوئی نہیں، اور پھر ساتھ ہی ساتھ اس پر جم گئے، اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے خدا پرستی پر قائم رہے۔ خدا اپنے ملائکۂ نصرت کو ان پر بھیجتا ہے: جو ہر وقت ان کو پیام شادمانی و کامرانی پہونچاتے رہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہ تو تمہارے خوف ہے نہ کسی طرح غمگینی۔ دنیا کی زندگی میں بھی تم خدا کی فتح و نصرت سے کامیاب ہوگے۔ اور آخرت میں بھی خدا کے کرم سے شادکام اللہ کی تمام نعمتیں تمہارے لئے ہیں۔ تم جو نعمت چاہوگے تمہیں ملے گی۔ اور جس چیز کو طلب کروگے پاؤگے یہ کرم ہے غفور الرحیم کا۔

پس تم اس مہینہ میں نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی یاد کا دعوی کرتے ہو۔ مجلسیں منعقد ہوتی ہیں، مولود خوانی ہوتی ہے سیرت کے جلسے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد یا مدح و ثناخوانی کا دعویٰ تمہاری زبان کرتی ہے اس کے اتباع کی فراموشی کے لئے تمہارا ہر عمل گواہ ہے۔ آخر یہ کیا ہے کہ باوجود حضور انور علیہ السلام کی یاد کے تم نے کامیابی حاصل نہ کی، کیا خدا کا وعدہ نعوذ باللہ غلط ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ

اس میں شرط یہ تھی اور ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

"خدا اب بھی غیروں کے لئے نہیں بلکہ صرف تمہارے لئے ہے۔ بشرطیکہ تم بھی غیروں کے لئے نہیں بلکہ صرف خدا کے لئے ہو جاؤ"

یہ تو میرے دلی جذبات اس لئے ہیں کہ تقریباً ۴ سال سے صرف حضور انور علیہ السلام کی حیات طیبہ کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا۔ سمجھا، اور مختلف طریقوں سے اس کو بیان بھی کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں، خواہ کوئی مجھ سے متفق نہ ہو، کہ بغیر اسوۂ حسنہ کے صحیح علم اور اتباع کے چارہ ہی نہیں۔ مولود خوانی پھیل چکی اور پھیلے گی اس میں کیا ہوتا ہے سب کو معلوم ہے مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور ربیع الاول ختم، مجلسیں ختم، سیرت کا موضوع مذاق بن کر رہ گیا۔ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ۲۳ سال میں انقلاب برپا کر دیا۔ وہ حیات طیبہ کا ہر ہر عمل ہی تو تھا جس کے ارتقائی منازل سے صحابہ کرام کی جماعت بہرہ اندوز ہو کر افق عالم پر چمکی، اقبال نے کہا ہے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنے وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے اپنے اپنے زاویہ نظر سے تقریروں کو مفاخرکا یا مباحثہ میدان بناکر ٹولیاں بنالیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک   ایک ہے سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک   کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

قوم بازیچۂ اطفال بن جاتی ہے اور مذہب کے نام پر مختلف جماعتیں بن جاتی ہیں۔ غرضکہ مذہب ایک محفوظ جنگل ہے جس میں چالاک لیڈر پناہ لیتے رہتے ہیں۔ اور بالعموم تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بسا اوقات یہ مصداق ضرور ہوجاتا ہے ؎

ذکر دیں ہونٹوں پہ ہے دنیا کی گھاتیں دل میں ہیں
صبحیں چہروں پر ہیں روشن اور راتیں دل میں ہیں

تجربہ و استقراء کے بعد میرا خیال یہ قائم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی، مکہ مکرمہ میں ۹۰ سورتیں نازل ہوئیں اور ۲۵ مدینہ منورہ میں۔ اس لئے سب سے پہلے مکی زندگی کے ہر ہر پہلو کو نمایاں کیا جائے اور عرب کا جو نقشہ اس وقت تھا اس کا اپنی قوم سے پورا جائزہ لے کر اُن کی اس زندگی کے ہر گوشہ سے متعارف کیا جائے اور وہ ایمانی طاقت یا جوہر جو مکی زندگی میں پیدا فرمایا گیا تھا اس کا تھوڑا سا حصہ بھی اگر قوم اختیار کرلے تو یہی حاصل کا سبب ہوگی۔ پھر مدینہ منورہ کی زندگی کے ہر ہر پہلو سے آشنا اور متعارف کیا جائے لیکن یہ کام ایسا نہیں ہے کہ صرف ربیع الاول ہی تک محدود رکھا جائے



سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

"دریچے کھلتے ہیں"

ابن محمود

اور پھر اس نے انتہائی نفرت و کراہت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ یہ اس کی زندگی کا تیسرا اور آخری اسٹیج تھا۔

پہلا اسٹیج وہ تھا جب اس نے اس کو گھڑا تھا۔ اس کی معصوم زندگی کا وہ دن جب وہ ایک ننھا سا بچہ تھا آنکھ کھولتے ہی اس نے اردگرد پھیلے ہوئے اپنے پورے ماحول کو اس کی عظمت کے آگے سرنگوں دیکھا تھا۔ رگوں میں حیوان رس دوڑا دینے والی اپنی ماں کو بھی اس کی عظمت کے گن گاتے دیکھا تھا۔

شفیق و جاں سپار اپنے باپ کو بھی اس کے آگے سربسجود دیکھا تھا۔

بے پناہ محبت کرنے والے اپنے بھائی بہنوں کو بھی اس کی تقدیس میں رطب اللسان دیکھا تھا۔

تب اس کے معصوم سے دل میں، اس کی عظمت و کبریائی، اس کے جلال و جبروت کی ایک ننھی سی کونپل نے سر ابھار لیا تھا۔ اور یہی کونپل بڑھتے بڑھتے ایک دن تناور درخت بن گئی تھی ——————

—————— یہ اس کی زندگی کا دوسرا اسٹیج تھا۔ جب وہ خود بھی اس کے آگے سرنگوں تھا۔ اور زمانے بھر کو اس کی عظمت کے آگے جھکا دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ یکایک ایک نورِ مجسم پیکرِ آتشیں بن کر اس کے درمیان آگیا۔ جس کے فولادی ہاتھوں میں ایک کلہاڑا تھا۔ اور وہ کلہاڑا اس نے اس کی آرزوؤں کے اسی شاداب و تناور درخت کی ان جڑوں پر لاکر رکھ دیا۔ جو خود اس کی اپنی زمین دل میں مضبوط اور گہری جمی ہوئی تھیں۔ پھر تو وہ تلملا اٹھا اور تلملا کر اپنی پوری طاقت و حشمت کے ساتھ اس نورِ مجسم سے ٹکرا گیا۔

اس کے ہاتھوں سے کلہاڑا چھین پھینکنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کر ڈالا۔ اپنے ذہن و فکر کی

ساری توانائیاں صرف کر ڈالیں۔ اپنی پونجی کی ایک ایک پائی لٹا دی۔ یہاں تک کہ نقد جان کی بازی لگا دی۔ اس نے اس کی راہ روک دینے کے لئے اس کے سامنے مصائب و مشکلات کے سر بفلک پہاڑ کھڑے کر دیئے اور جبر و تشدد کے ہیبت ناک گرداب بلا حائل کر دیئے۔ مگر وہ پیکر نور بھی عجیب دل و جگر کا مالک نکلا۔ وہ عزم صمیم و بے پناہ حوصلہ کے رخش بے عناں پر سواران سب سے لڑتا ہوا آگے اور آگے ہی بڑھتا رہا۔ وہ تمام گرداب ہائے بلا کو پار کر کے اور تمام پہاڑوں کو پھلانگ کر اپنی کامرانیوں کے راستے نکالتا ہی رہا۔

تب پھر ایک دن وہ آگیا جب اس کے اپنے لئے خود اپنے ہی مرزبوم میں کوئی جائے پناہ باقی نہ رہی۔ ہر محاذ جس کا آغاز اس نے ہبل کی عظمت و جلالت شان کو دوبالا اور سربلند کرنے کے لئے کیا تھا۔ اس کی ہزار جانبازیوں اور سرفروشیوں کے باوجود شکست پر ختم ہوتا رہا یہاں تک کہ اس کی ساری طاقت و شوکت پارہ پارہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ اس وقت اس کے لئے اسی پیکر نور کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے یا پھر ملک کو خیرباد کہہ دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہ گیا تب اس کے دل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ملک چھوڑ دے گا۔ جس سے ایک عمر وہ غیرت کے نام پر لڑتا رہا تھا۔ اس کے آگے سرنگوں نہیں ہوگا۔

اس فیصلے کے بعد وہ اسی رات اپنے اس شہر سے جہاں کبھی اس کی بہادری کی دھاک جمی ہوئی تھی، پہرا کر چپکے سے چوروں کی طرح نکل گیا۔ آج پورے ملک میں اس کا کوئی ——————

ساتھی

ہمدرد

اور مددگار نہ تھا

اور وہ جس سے مدد کی آخری امید ہو سکتی تھی خود اس کا ہلکا پھلکا طلائی مجسمہ اس کی بھاری پوستین کے منہ چھپائے اس نزول بے بسی میں اس کا شریک تھا۔ اور وہ اسے اپنے سینے سے یوں بھینچے ہوئے لئے جا رہا تھا۔ جیسے اسے امید ہو کہ اس سرزمین سے دور جا کر بالآخر اپنے چلتے ہوئے آنسوؤں کی نذر کے

نعیمیا پنے اس رد دُھٹے ہوئے معبودِ جلیل کو منا لے گا جس نے کسی نامعلوم سبب پر بھڑکے ہوئے غیظ نے نہ صرف اس کے ہی خرمن دعزت ووقار کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ بلکہ جس کی لپیٹ میں آکر خود اس معبود جلیل کے اپنے جلال وجبروت کا شیش محل بھی خاکستر ہو کر رہ گیا تھا۔ یا پھر جیسے اسے امید ہو کہ دو رجا کردہ کسی دن فتح وظفر کا جھنڈا لہراتا ہوا اپنے پہلے سے شکوہ و طمطراق کے ساتھ دوبارہ اپنے ملک میں واپس آجائے گا۔ اور ایک بار پھر اپنے ناکام معبود کی کبریائی کا ڈنکا بجا کر چھوڑے گا۔

اور اس لمحے جب چاندنی رات میں ہلکے ہلکے ہوا کے خنک آفریں جھونکے دل میں گدگدیاں کر رہے تھے پُرسکون سمندر کا وہ سفر بھی کس قدر وجد انگیز اور روح پرور تھا جب اس کی کشتی سینۂ موج پر یوں رواں تھی جیسے کوچۂ بہار میں سبک سیر صبا کے دوش پر نکہت گل کی سواری محوِ خرام ہو۔ اس وقت خاموش اور گمبھیر فضا میں چپوؤں کے چلانے کی آوازیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کہیں دور فرشِ گل پر رقاصۂ بہار کے نقرئی گھنگھرو چھنک رہے ہوں اور ہر بار سطح آب پر چپوؤں کے ٹکراؤ سے چاندنی کے عکس میں سمندر کی گہری نیلگوں رولئے آب پر مرتعش سیمیں لہروں کا ایک ایسا گول دائرہ ابھر کر دور تک پھیلتا چلا جاتا جیسے کسی الھڑ دوشیزہ نے ادائے ناز سے موتیوں کی حسین مالا توڑ کر بے ترتیب انداز میں بکھیر دی ہو۔

وہ ابھی حسن فطرت کے ان دلکش مناظر سے جی بھر کر لطف اندوز بھی نہ ہو پایا تھا کہ یکایک مغربی افق سے ابھر کر ابر کا ایک ہلکا سا ٹکڑا اترتا ہوا آیا اور دیکھتے دیکھتے فضائے بسیط پر محیط ہو گیا۔ چاندنی روپوش ہو گئی۔ اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ہوا کے سبک خرام جھونکے جھکڑوں اور پرشور آندھیوں میں تبدیل ہو گئے۔ سطح سمندر کے پرکیف سکون نے ہلاکت خیز طلاطم کا روپ دھار لیا۔ ہوا کی تیز اور خوفناک سائیں سائیں کی آوازوں اور بپھری ہوئی غضبناک موجوں کے شور نے مل جل کر ایک خطر انگیز طوفان برپا کر دیا۔ اور اس ہولناک طوفان کے سبب جبڑوں میں پھنس کر اس کی کشتی یوں ہچکولے کھا رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت ہی حقیر سا تنکا ہو۔ چپو بیکار ہو چکے تھے اور بادبانوں کا سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ پوری کشتی میں ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ لوگوں کی چیخ پکار اور بتوں کے نام کی دہائیاں

اور بچے کا رونا، عورتوں اور بچوں کے نالہ و شیون، کشتی کے عملے کی بھاگ دوڑ اور بچاؤ کے ہنگاموں میں کان پڑی آواز تک سنائی نہ دے رہی تھی۔

اور وہ اس دل الٹ جانے والے لمحے میں کچھ دیر کے لئے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر ہبل کے ننھے سے طلائی بت کے آگے سر بسجود گڑگڑا کر گڑگڑا کر نجات کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

"ہبل! اے میرے معبود جلیل تری عظمت و جبروت کی قسم تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے گرویدہ و پرستار عکرمہ نے ہوش سنبھالنے سے آج تک ایک لمحے کے لئے بھی تجھ سے سرتابی نہیں کی بلکہ تو اس کی وفاداری کو بدر و حنین کے معرکوں میں اچھی طرح پرکھ چکا ہے۔ اس نے تیری آن کو بچانے اور تیری عظمت کا نشان سر بلند رکھنے کے لئے بار ہا تلوار کی دھار سے موت کے پر باندھ دیئے ہیں۔ اور اس راہ میں لڑتے ہوئے خود اس نے کبھی موت کی پروا نہیں کی۔ پھر آج جب وہ تیری ہی شوکت رفتہ کے واپسی کے لئے ایک غیر معلوم منزل کی طرف گرم سفر ہے۔ تو اسے یوں کس مپرسی کے عالم میں سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے نہ کر تیرے قبضۂ قدرت میں کیا کچھ نہیں"؟!

...... کیا تو طوفان کو تھما نہیں سکتا ——— ؟!!

ٹھیک اسی وقت جب وہ کشتی کے ایک گوشے میں ہبل کے طلائی بت کے سامنے سربکف زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ کشتی کے دوسرے حصوں میں لوگوں کا شور فریاد بڑھتے بڑھتے واویلا کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اور ٹھیک اسی لمحے یکا یک کسی نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"آقا! آقا سر اٹھائیے۔ خداؤں کی امان اٹھ رہی ہے اور ہماری کشتی ڈوب رہی ہے۔ اب تو اسے صرف ایک خدا ہی بچا سکتا ہے" یہ اس کا وفادار غلام تھا۔

"کون ——— ؟ ...... ایک خدا" !!! عکرمہ چونک کر، اور بے رحم طوفانی موجوں میں ڈانواں ڈول کشتی کی نازک صورت حال کا اندازہ کر کے بوکھلائے ہوئے انداز میں چیخا۔

"ہاں ایک خدا۔ - - - اور صرف ایک ہی خدا"! غلام نے گھبرائے ہوئے ایسے لہجے میں جواب دیا جس میں بے بسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"کیا کہا صرف ایک خدا ہی"؟!!! ———— اور جواب کے لئے عکرمہ کی نگاہیں بدحواس غلام کو ڈھونڈتی ہی رہ گئیں اور وہ اتنی دیر میں بوکھلایا ہوا کسی اور طرف جا چکا تھا۔

اور پھر خود ہی عکرمہ جیسے خواب سے جاگ کر "مگر..... مگر..... یہ ہبل..... لات..... منات ..... اور عزیٰ ———— آخر یہ کس دن کام آئیں گے، اور پھر جیسے اس کی نگاہوں میں بجلی سی کوندگئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے بند دریچے کھل گئے۔ پھر وہ بے اختیار بول پڑا۔

"عکرمہ! کیا اب بھی تیری جہالت کا طلسمی خواب نہ ٹوٹے گا۔ اور کیا تو اب بھی اس فریب کار طلائی چہرے کو نہ پہچانے گا۔ یہ جھوٹے معبود اپنے ہی کب کام آسکے جو آج یہ تیرا بیڑا پار لگانے آجائیں گے۔ غور تو کر اگر ان میں ذرا بھی سکت ہوتی تو یہ اپنی غفلت پر والہانہ جان دینے والے اپنے پرستاروں کو ارض مقدس کے ایک ایک چپے سے اس طرح بے کسی کے عالم میں ذلیل و رسوا ہو کر بے دخل نہ ہونے دیتے۔ ان سے اور امید رکھنا۔؟! ———— جھوٹ، فریب اور مکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عکرمہ جب یہ کچھ کہہ رہا تھا تو اس کی مٹھیاں فرط جوش میں عجیب طرح سے بھینچ گئی تھیں اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ اپنی رو میں کہتا ہی چلا گیا۔

"عکرمہ! جب سارے محسوس و موہوم سہاروں کے ٹوٹ جانے پر آدمی دانستہ یا نادانستہ صرف ایک خدائے واحد و قہار ہی کا سہارا لینے پر مجبور ہوا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیکے بغیر چارہ کار نہ ہو تو پھر محمدؐ ہی سے پرخاش کس لئے۔؟! آخر خدا کے اس صداقت شعار بندے کا جرم اس کے سوا اور تھا ہی کیا کہ اس نے ایک سچی، صاف ستھری حقیقت کو پا لیا اور پھر بے لاگ طریقے پر زمانے کو اس کی طرف دعوت دے ڈالی عکرمہ سوچ یہ بھی کوئی جرم ہوا کہ تو اس پر ایک عمر اس سے برسر پیکار رہا۔ سوچ کیا وہ دعوت تیرے اپنے دل کی آواز اور فطرت کی پکار نہ تھی؟!

پھر جب آج وہی سچائی اور حق غالب آ گئے تو تو اس سے دور جہالت کی ایک موہوم منزل کی طرف تاریکیوں میں بھٹکتے پھرنے کے لئے بھاگ رہا ہے ———— کیا یہ فرار نہیں؟!

فرار ————

زندگی کی صاف ستھری حقیقتوں سے
اللہ واحد کے بھیجے ہوئے حق کی نعمتوں سے

اور پھر

اس کے رسول برحق کی مخلصانہ خیرخواہیوں سے

مکرمہ لوٹ اب سے بھی لوٹ کہ تو پناہ کی تلاش میں پناہ چھوڑے جا رہا ہے۔ پناہ تو اسی دامن کے سائے تلے ملے گی جسے تو اپنی نادانی و بے بصیرتی سے تار تار کر ڈالنے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے۔ لطفِ حیات تو انہیں کے سامنے سر جھکا دینے اور گھٹنے ٹیک دینے میں ہے جن کی کسی بے غرض نصیحت پر کان دھرنا بھی ایک عمر تجھے گوارا نہ ہوا۔

اور پھر ایسا ہوا کہ جب مکرمہ کے ذہن کی بھٹی میں خیالات کی یہ چنگاریاں چٹک چٹک کر اس کے رگ و پے میں پاکیزہ حرارت کا ایک عجیب سرور لا گئیں نئی بھر رہی تھیں تو مکرمہ کی طمانیت کی ایک موج نور نے اسکے گرد ہالہ کر لیا تھا۔ اور باہر کی دنیا میں آیا ہوا طوفان ختم ہو چکا تھا اور اس کی ڈانوا ڈول کشتی گرداب بلا کے فنا کوش دہانے سے باہر آ چکی تھی۔

تب مکرمہ اپنے خیالات کی رو کے اس سرے پر پہنچ کر ایک معنی خیز انداز میں مسکرا پڑا اور اس کے لب پر اس عظیم اور سچی حقیقت کا اعتراف آ گیا جس کو جھٹلانے میں وہ ایک زندگی گذار آیا تھا۔

"خدائے ذوالجلال تو شاہد رہ، کہ میں تری ذات لاشریک اور تیرے رسول برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔"

اور پھر اس نے انتہائی نفرت و کراہت سے ہبل کے منہ پر یہ کہہ کر تھوک دیا ؎

"تراشیدم، پرستیدم، شکستم"!!

یہ اس کی زندگی کا تیسرا اور آخری اسٹیج اور اس کا پہلا دن تھا۔

ایک تاریخی خاکہ — از ابن احمد

ایک بھیانک خلأ

طلوع اسلام کا دور ہے، دیارِ عرب کا ایک آباد شہر اور شہر کا مرکزی حصّہ ـــــــــ سورج مشرق میں گھنے کھجور کے پیڑوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا ابھرتے سورج کی ایک ایک کرن میں تازگی کی روح پھونکتی ہوئی زندگی کا نیا ولولہ پیدا کر رہی ہے اس کا سب سے زیادہ اثر کھجور کی لمبی سبز پتیوں سے ظاہر ہو رہا ہے جو ہوا کی معمولی تحریک سے بھی تھرتھرا اٹھتی ہیں۔ سورج کی پہلی کرن نواح کی اکیلی مسجد کے بلند سادہ میناروں سے ٹکرا رہی ہے ـــــــــ شب کو آسمان نے جو شبنمی امانت زمین کو دی تھی اور جسے ریت کے ننھے ننھے ذروں نے سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر لیا تھا اب رفتہ رفتہ سورج کی سنہری کرنیں بھی انہیں واپس لینے آ رہی ہیں۔ اور ایک ایک ذرہ کا سینہ چاک کر رہی ہیں ـــ لیکن نور میں نہائی ہوئی مسجد کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جو ان شوخ اور چنچل کرنوں کی چیرہ دستی سے محفوظ ہے۔ یہاں کچھ نورانی شکلیں نظر آ رہی ہیں جو فطرت اور خلقت کے اعتبار سے ہیں تو یقیناً انسانی لیکن آج کے انسانوں میں ان کی مثال تلاش کرنا بے سود ہے۔ ان کے چہرے روشن، شخصیتیں جاذب اور انداز پروقار ہیں۔ سنجیدگی ان کا شیوہ اور متانت ان کا وطیرہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ تعداد میں معتدبہ ہیں اور نیم حلقہ بنائے بیٹھے ہیں۔ وسط میں ایک ایسی جاذب و دلکش شخصیت ہے جو نمایاں کی تو نہیں گئی پر تاہم نمایاں ہو گئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ نمائندگی بلا حکمت نہیں نہ یہ نشست بلا مقصد ہے۔ عموماً لوگوں کی نگاہیں حلقہ کے مرکزی نقطہ پر لگی ہوئی ہیں جیسے وہاں سے وہ کسی متوقع چیز کے منتظر ہوں ایک صبر آزما اور باوقار خاموشی کے بعد ہی جاذب اور دلکش شخصیت گویا ہوتی ہے جو اس نیم حلقہ کے درمیان نمایاں ہونے کے باوجود انہیں حلقہ نشینوں میں سے ایک معلوم ہوتی ہے۔

ــ سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

"کیوں علقمہ کا کیا حال ہے؟" یہ ایک عام استفسار ہے جو وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے لیکن جواب دینے میں کوئی عجلت نہیں کرتا۔ سب تامل کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے سوال سادہ ہونے کے باوجود اس کا مفہوم نہیں سمجھا یا اس اندیشہ سے توقف کر رہے ہیں کہ جواب دیتے ہوئے کہیں دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ غرض یہ خاموشی اور تامل برمبنائے حکمت معلوم ہوتا ہے ——— بالآخر حاضرین میں سے ایک نے حکمت کا حق ادا کرنے کے بعد جواب دینے کی ذمہ داری لی اور ادب سے کہا ——— "یا رسول اللہ! علقمہ کی حالت خراب ہے۔" یہ سنکر حاضرین میں فکر و تشویش کی ایک عام لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ لیکن اس کا خاص اثر اس مرکزی شخصیت پر یوں ظاہر ہو رہا ہے۔ جیسے کسی راعی کو اپنے ریوڑ میں سے کسی بھیڑ کے مبتلائے عارضہ ہونے کی اچانک خبر پاکر ہوتا ہے۔ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد آپ حاضرین میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا کر علقمہ کے متعلق تازہ اور تفصیلی خبر لاؤ۔ مذکورہ شخص تسلیم و رضا کے انداز میں اٹھتا ہے اور تعمیل حکم و تکمیل شوق کے دوگونہ جذبات کے ساتھ صحن مسجد سے جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ جاتے ہوئے شخص کو حاضرین جب تک وہ نظر آتا ہے دیکھتے رہتے ہیں ان کے انداز نظر سے عام فکر و تردد کی کیفیت نمایاں ہے۔ گویا بدحال انسان دنیا کا ایک فرد نہیں بلکہ ان کے اپنے جسم کا ایک عضو ہے اور ایک عضو کی تکلیف سے سارے جسم کو تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ آخرکار وہ اپنی نگاہیں پھیر کر پھر اس مرکز پہ جا دیتے ہیں جہاں وہ پہلے لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس بار صاف ظاہر ہے کہ ان کی نظریں سامنے سے کسی چیز کی متوقع ہونے کی بجائے پیچھے سے کسی اطلاع کی منتظر ہیں۔

تھوڑی دیر اسی حالتِ انتظار میں رہنے کے بعد مسجد کے صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ ملتی ہے اور جانے والا واپس آجاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ قریب ہو کر وہ عجیب درد انگیز لہجہ میں کہتا ہے ———

"حضرت! علقمہ کی حالت واقعتاً نازک ہے، نزع کا عالم ہے نہ دعا کرنے کے قابل ہے نہ خود خدا کی طرف توجہ کر سکتا ہے!" یہ سنکر سامعین کے درمیان فکر و تشویش کی عام لہر تیز ہو جاتی ہے

اور وہ مرکزی شخصیت دفعتاً پیکرِ غم میں بدل جاتی ہے۔ آپ باندازِ تأسف فرماتے ہیں ـــــــ

"کیا علقمہ کی ماں زندہ ہیں؟" سامعین میں سے جواب ملتا ہے ـــــــ "جی ہاں زندہ ہیں"

پھر آپ قدرے اطمینان کے لہجہ میں کہتے ہیں ـــ "انہیں بلا لاؤ ـــ اور اگر علقمہ کی ماں بوڑھی اور ضعیفہ ہوں تو انہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں میں خود ان کے پاس جاؤں گا" ـــــــ یہ سن کر وہی پہلا شخص حلقہ سے اٹھتا ہے اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ حاضرین پہلے سے زیادہ حیرت و حسرت کے انداز میں بیٹھے ہیں۔ ان کے نورانی چہروں پر کسی انجانے خوف کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ آنکھیں پرشوق انداز میں کھلی ہوئی ہیں اور مرکزی نقطہ سے لگی ہوئی ہیں۔

سورج کا سراُفق مشرق پر پورا ابھر چکا ہے۔ زرد زرد کرنیں سفیدی مائل ہوتی جا رہی ہیں اور رفتہ رفتہ مسجد کے مناروں سے گذر کر مسجد کے تمام بالائی حصوں میں پھیلنے لگی ہیں۔ ریت کے ننھے ننھے ذرے شب کی دی ہوئی شبنمی امانت واپس کرنے لگے ہیں اور اس کی جگہ نورانی امانت کے حامل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہوا تند و تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کھجور کے لمبے پتے سانپوں کی طرح لہرا رہے ہیں۔ ان کی سرسراہٹ اب خوفناک حد تک بڑھ چلی ہے۔

وہ شخص جو مسجد کے حلقہ نشینوں کے درمیان سے اٹھ کر چلا تھا مسجد کے عقبی حصہ سے ہو کر ایک تنگ گلی سے گزرتا ہوا تیز قدموں کے ساتھ اس مکان کا رخ کرتا ہے جس کا دروازہ اب بالکل سامنے نظر آ رہا ہے، قریب پہونچ کر دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ مکان کے اندر سے آہ اور اذیت بخش کراہ کی مسلسل مگر نحیف آواز آ رہی ہے ـــــــ دستک کی آواز سن کر تھوڑے ہی توقف کے بعد ایک ضعیفہ برآمد ہوتی ہے اور آنے والے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتی ہے ـــ آنے والا کہتا ہے ـــ "چچی اماں بھائی علقمہ کے بابت حضورؐ نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ معذور ہوں تو وہ خود تشریف لائیں آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پیغام سے ضعیفہ کو بے حد سکون ملا ہے۔ وہ بڑے عزم و اشتیاق کے انداز میں کہتی ہے ـــــــ

"بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کا رسولؐ بلائے اور میں حاضر نہ ہوں؟ ٹھہرو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں"

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

ضعیفہ یہ کہہ کر کچھ وقفے کے لئے اندر جاتی ہے پھر گھر سے نکل کر قاصد کے ہمراہ ہو لیتی ہے۔ قاصد جس راہ سے آیا تھا اسی راہ سے ہو کر مسجد پہونچتا ہے۔ صحن مسجد میں قدم رکھتے ہی لوگوں کی نگاہوں کا ہجوم ان کا استقبال کرتا ہے۔ حلقے کے قریب پہونچکر ضعیفہ ایک نظر پورے ماحول پر ڈالتی ہے۔ پھر حضورؐ کی جانب متوجہ ہو کر آپ پر سلام بھیجتی ہوئی حکم کی منتظر رہتی ہے۔ آپ سلامتی کا جواب سلامتی سے دیتے ہوئے نہایت مہربانی سے پیش آتے ہیں اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ ضعیفہ بیٹھتی ہوئی آپ کی طرف پرشوق اور احسان مندانہ انداز میں دیکھتی ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں ——

"آپ کا لڑکا علقمہ کیسا ہے؟" یہ سنکر دفعتاً ضعیفہ کے چہرہ سے پچھلی کیفیت زائل ہو جاتی ہے اس کی بجائے اس کے بشرے سے اس کے اندرونی کرب و بے چینی کا صاف اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ قدرے تامل کے بعد مغموم انداز میں جواب دیتی ہے ——

"یا حضرت! علقمہ بیمار ہے، موت کے دروازے پر ہے مگر موت نہیں آچکی اور نزع کی ایسی سخت تکلیف ہے کہ سنگدل سے سنگدل اور دشمن سے دشمن بھی اس کی حالت کو دیکھکر ضبط نہیں کر سکتا، جو دیکھتا ہے اس کے حال پر آنسو بہاتا ہے کیونکہ اس کی زبان سے دعا و استغفار نکلتی ہے نہ خدا کی طرف دھیان لگاتا ہے ——"

اس تفصیلی انداز میں علقمہ کی حقیقی حالت کے متعلق جان کر عام حاضرین پر تو وہی پہلے جیسا اثر اور گہرا ہو جاتا ہے یعنی خوف و ہراس کی لہریں تیز تر ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ جواب پاکر آپ کی آنکھوں سے خوف و ہراس کی بجائے تجسس کی جھلک نمایاں ہے۔ آپ نہایت پرسکون انداز میں ضعیفہ سے دریافت فرماتے ہیں۔

"آپ کے لڑکے سے ایسا کون سا بھیانک گناہ ہوا ہے یا اس کی زندگی میں وہ کون سا بھیانک خلا ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کے رحم سے اس قدر دور پڑا ہوا ہے حالانکہ خدا کا رحم تو ماں کے رحم سے ستر درجہ بڑھ کر ہے اور اس کی شفقت و محبت ماں کی شفقت و محبت سے جس نے تم کو جنا ہے ستر درجہ بڑھ کر ہے"

آپ کا یہ ارشاد سن کر تھوڑی دیر کے لئے ضعیفہ کسی سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

وہ اپنے ذہن پر ناقابل برداشت زور ڈال کر ماضی کے دھندلکوں سے کسی ناخوشگوار یاد کو حال کے پردے پر کھینچ لانے کی کوشش میں معروف ہے۔ اس کی ویران آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے کامیابی کی ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوتی ہے لیکن پھر دفعتاً وہ چمک غائب ہو جاتی ہے۔ ضعیفہ نہایت افسردہ اور تھکے ہوئے انداز میں حضورؐ سے مخاطب ہوتی ہے ——

"یا رسول اللہ! میرا بچہ نہایت متقی، پرہیزگار، نیک، پارسا اور دیانت دار ہے۔ نماز پنجگانہ وقت پر ادا کرتا ہے۔ رات کا بیشتر حصہ اپنے خالق کے آستانے پر نہایت عاجزی سے گذارتا ہے اور دعائیں کرتا ہے۔ رمضان کے پورے روزے رکھتا ہے۔ ندیہ ہونے پر سخاوت کرتا ہے، محتاجوں، مسافروں کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ یتیموں کے ساتھ تواضع اور ہمسایوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے۔ غرض قرآن کریم کے سارے احکام کا پورا پورا پابند ہے" —— یہ پوری تقریر غور سے سنتے ہوئے آپؐ کے چہرے بشرے سے وہی غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے آثار نمایاں ہیں، پھر کسی قدر تذبذب کے انداز میں آپؐ فرماتے ہیں ——

"معلوم ہوتا ہے علقمہ نے اپنی ماں کو ناراض کیا ہے ورنہ ان تمام اعمالِ صالحہ کے باوجود خدا کی رحمت سے محروم کیوں ہوتا؟" یہ سنکر ضعیفہ کی ویران آنکھوں میں اچانک پہلی جیسی چمک عود کر آتی ہے جیسے ان الفاظ نے اس کی بوڑھی یادداشت کو بڑھکر سہارا دے دیا ہو۔ وہ دفعتاً بول اٹھتی ہے ——

"سچ فرمایا آپؐ نے۔ میرا لڑکا علقمہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے اور اس کی حمایت میں اکثر مری مخالفت کی پروا نہیں کرتا تھا۔" اس انکشاف حال سے حاضرین کے اندر سے فکر و اندیشے کی تمام لہریں زائل ہو جاتی ہیں۔ حلقہ کی مرکزی شخصیت کی آنکھوں سے تحقیق و تجسس کی کیفیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی جگہ غم و غصہ نے لے لی ہے۔ آپؐ کا چہرہ جلال سے تمتما اٹھتا ہے۔ آپؐ عزم و ارادہ کی بے پناہ قوت کے ساتھ بول اٹھتے ہیں۔ "لکڑیاں جمع کر کے ایک الاؤ لگاؤ!"

جب تعمیل حکم ہو چکتا ہے تو آپ پہلے سے زیادہ عزم و ارادہ اور جوش و جلال کے ساتھ فرماتے ہیں۔
"علقمہ کو لاؤ اور اس الاؤ پر رکھکر آگ لگا دو ——!" ضعیفہ یہ سنکر ایک لمحہ کے لئے سکتہ میں آجاتی ہے

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ رہا ہو پھر بے اختیار چیخ اٹھتی ہے ——— آپ دفعتاً اس کی طرف مخاطب ہوتے ہیں اور تفہیم و تلقین کے انداز میں فرماتے ہیں ———

" اے نیک بخت خاتون یہ تیری نافرمانی کرکے سزا کا مستحق ہو چکا ہے اور یقیناً جہنم کی آگ میں جھونکا جائے گا۔ دنیا کی یہ آگ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لئے علقمہ کی خطا معاف نہ کرنے کی صورت میں جو سزا اسے مرنے کے بعد ملنے والی ہے اس کا کچھ حصہ یہاں دنیا میں دیکھ لو اور سمجھ لو کیوں کہ خدا کی رحمت اس اولاد پر کبھی نازل نہیں ہوتی جو اپنی ماں کو ناراض کرتا اور اس کے دل کو دکھاتا ہے " ——— آپ کے ارشاد سے جو اثر ضعیفہ نے قبول کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ان باتوں کے اندر اسے راحت و سکون کا سامان مل چکا ہے۔ وہ بے تابی سے پکار اٹھتی ہے ——— " حضور میں بخوشی اپنے لڑکے کا قصور معاف کرتی ہوں اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اس کا قصور معاف کرے اور اس پر رحم فرمائے "

حالات معمول پر آچکے ہیں۔ جذبات کے دھارے تھم چکے ہیں۔ اس گفتگو سے سامعین پر ایک اطمینان بخش سکوت طاری ہے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک کے قلب مضطر کو قرار آگیا ہے۔ رسول اللہ صلعم حاضرین کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ فرماتے ہیں اور خود اٹھ کر علقمہ کے مکان کا رخ کرتے ہیں۔ دوسرے بھی آپ کی تقلید کرتے ہوئے ہمراہ چلتے ہیں ——— دروازہ پر پہنچ کر آپ ٹھہر جاتے ہیں۔ علقمہ کی بوڑھی ماں پہلے اندر داخل ہوتی ہیں پھر سب کو اندر آنے کا اشارہ کرتی ہیں۔ آپ کے ساتھ ساتھ دوسرے بھی مریض

کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ مریض ایک ساتھ بہت سے قدموں کی چاپ سن کر اچانک آنکھیں کھول دیتا ہے اور خاموش نگاہوں سے آنے والوں کا استقبال کرتا ہے۔ اس کی اٹھی ہوئی نگاہ پہلے رسول اللہ پر پھر اپنی ماں پر پڑتی ہے لیکن شاید بارِ ندامت سے دوسرے ہی لمحہ جھک جاتی ہے۔ بوڑھی ماں ایک مسرت بخش حیرانی کے ساتھ مسلسل دیکھ رہی ہے کہ مریض کے چہرے پر اس وقت کرب و بے چینی کے آثار سے زیادہ سکون و اطمینان کے آثار نمایاں ہیں۔

مرض اور مریض کے احوال کی تبدیلی کے ساتھ ماحول کی تبدیلی ایک عجیب بات تھی۔ لیکن اس کا مظاہرہ بدیہی طور پر ہو رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے سورج اپنی شوخ اور چمکیلی کرنوں کو واپس بلا لیتا ہے جو ہلکی تیزی و تندی سبک خرامی میں بدل جاتی ہے۔ صاف شفاف نیلگوں آسمان پر بادل کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تیرتے نظر آ رہے ہیں۔ زمین کے سینے میں جلتے ہوئے ذرات کے شرارے بجھ چکے ہیں جس سے زمین پر بسنے والوں کو ٹھنڈک کی عام کیفیت محسوس ہو رہی ہے کھجور کے لمبے گنجان درختوں پر سرخوشی کا عالم طاری ہے۔ جس سے وہ ایک ساتھ آہستہ آہستہ جھوم رہے ہیں ـــــ دفعتاً دروازہ سے ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر داخل ہوتا ہے جسے محسوس تو وہاں سبھی کرتے ہیں لیکن علقمہ اس کے اثر سے چونک سا جاتا ہے ایک جھرجھری سی لینے کے بعد اپنی ملتجیانہ نگاہیں قریب بیٹھی ہوئی اپنی بوڑھی ماں پر گاڑ دیتا ہے۔ بوڑھی ماں اس التجا کا مطلب پاتے ہوئے مامتا کے اتھاہ جذبات کے ساتھ علقمہ سے لپٹ جاتی ہے۔ اور رقت طاری کرتے ہوئے کہتی ہے ـــــ

"بیٹا میں نے تمہیں معاف کیا اور خدا سے تمہارے لئے رحم کی بھیک مانگتی ہوں"

علقمہ شکر و امتنان سے بھری اور جھکی ہوئی نگاہوں سے پہلے رسول اللہ کی طرف دیکھتا ہے پھر انہیں نگاہوں سے اپنی بوڑھی ماں کی طرف دیکھتا ہوا اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے!

علقمہ بوڑھی ماں کے قدموں میں پڑے ہوئے ایسا محسوس کر رہا ہے گویا اس کی عارضی زندگی کی سکوں انجامیاں حیاتِ ابدی کی راحت خیزیوں سے ہمکنار ہونے والی ہیں۔

اسی وقت دروازہ سے ٹھنڈی ہوا کا دوسرا جھونکا آتا ہے اور علقمہ کو ابدی نیند سلا کر گزر جاتا ہے

اس وقت حاضرین میں سے سب کے چہروں پر حیرت، حسرت اور انتہائی افسوس کی کیفیت غالب آجاتی ہے لیکن تھوڑی دیر اس عالم میں رہنے کے بعد سب سکون و اطمینان کی سانس لے رہے ہیں کیوں؟

شاید اس کا جواب مطمئن سکون یافتہ روح دے سکے جو اس عالم ابتلا سے نجات پاکر نشاط ابدی کی منزل کی طرف سرگرم پرواز ہے۔

وحیدالدین خاں

مستقبل پکار رہا ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انسانی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے زمین پر حقیقی معنوں میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اور جس کے نتیجے میں سماج کے اندر وہ تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کی مثال کسی بھی دوسرے سماجی نظام میں نہیں ملتی۔

اسلامی تحریک اسی تاریخ کو دہرانے کا عزم ہے۔ مگر جب کچھ خدا کے بندوں کی طرف سے اس ارادے کا اظہار کیا جاتا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بات کا امکان ہے کہ گزرے ہوئے اس تاریخی دور کو واپس لایا جا سکے۔ معترضین کا خیال ہے کہ اس تاریخ سے کسی کو اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان اس ملک میں اقلیت میں بستے ہیں۔ پھر جمہوری دور میں جب کہ اکثریت کی حکمرانی کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے، کوئی اقلیت کس طرح اپنے نظریہ کو اجتماعی زندگی میں غالب کر سکتی ہے۔

اس کے جواب میں میں دو بات کہنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ بات بجائے خود غلط ہے کہ اسلام کی حمایت صرف وہی لوگ کریں گے جو اس وقت مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی شخص اسلام کے حق میں رائے دینے والا نہیں مل سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ اگر اس غلط بات کو کسی درجے میں صحیح فرض کر لیا جائے تو اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ انقلاب لانے کے لئے عددی اکثریت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک منظم اقلیت بھی کسی ملک میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لئے کافی ہے۔

اب پہلی حیثیت کو لیجئے۔ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے سوا دوسرے فرقے کے لوگ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

اسلام کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اس کی بنیاد کیا ہے۔ کیا اب تک کے واقعات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلی تاریخ میں اس ملک کے لاکھوں آدمیوں نے اپنے آبائی دین کو ترک کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہا ہے اور آج بھی ایسا کر رہے ہیں۔ اس تعصب اور دشمنی کے دور میں بھی ہم قبول اسلام کے واقعات سنتے رہتے ہیں۔ پھر اس کھلی ہوئی دلیل کی موجودگی میں کس طرح اس کے خلاف دعویٰ کیا جاتا ہے۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ قبول اسلام کے یہ واقعات بہت کم تعداد میں پیش آرہے ہیں۔ مگر ایسے کسی ایک واقعہ کا ہونا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی قسم کے دوسرے واقعات ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی گروہ کے ایک شخص کا اسلام لانا اس گروہ کے تمام لوگوں کے اسلام لانے کا امکان ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسی ملک میں ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب کہ لاکھوں کروڑوں لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ بسا اوقات پوری کی پوری آبادی نے ایک ساتھ اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب اگر آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ اسلام کی طرف زیادہ تعداد میں نہیں کھنچ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام بدل گیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ بدل گئے ہیں جو دوسروں کو اسلام کی طرف کھینچنے والے تھے۔ قبولِ اسلام کے واقعات کا کم ہونا ہماری تبلیغی کوششوں کی کمی کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ خود قبولِ اسلام کے عدمِ امکان کو۔ اس کے اسباب ہمارے اندر ہیں نہ کہ دوسروں کے اندر۔

اس موقع پر میں سابق اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کا ایک قولِ نقل کروں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح خود مسلمان، غیر مسلموں کو اسلام کی طرف آنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔

"بلاشبہ اسلام فی نفسہ بہترین مذہب ہے۔ لیکن اگر میں اسلام اختیار کرنا چاہوں تو مجھے سب سے پہلے یہ عقدہ حل کرنا ہوگا کہ شیعہ بنوں یا سنی، قبروں کو پوجوں یا خدا کو۔ مسلمان مختلف فرقوں میں اس طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے میں جانتا ہوں کہ جس جوش سے تعزیوں اور قبروں کو پوجا جاتا ہے۔ اگر میں وہ جوش ظاہر نہ کر سکا تو مجھے وہابی کہہ کر اسلام سے خارج کر دیا جائے گا۔

دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہیے کہ خود مسلمان بن جائیں اور اپنی اندرونی

تفرق دور کریں:

کسی دین کے متعلق یہ فیصلہ کہ لوگ اسے قبول کریں گے یا نہیں صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے اسباب خود اس دین کے اندر موجود ہوں۔ ایسے اسباب جو دین کے باہر پائے جائیں وہ بالکل غیر حقیقی ہیں۔ وہ وقتی طور پر تو ضرور کسی کو روک سکتے ہیں مگر مستقل رکاوٹ کا سبب نہیں بن سکتے اسلام کے خلاف اس وقت جو تعصب اور بیزاری پائی جا رہی ہے۔ وہ اسی قسم کی ایک غیر حقیقی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیر حقیقی چیز جو کسی کی طرف منسوب ہو جائے۔ اس کی بنا پر اس کی عدم مقبولیت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام ایک فطری دین ہے جو انسان کے اپنے اندرونی مطالبات کا جواب ہے۔ وہ ابدی کامیابی کی شاہراہ ہے۔ وہ ساری مشکلات کا حل ہے۔ وہ کائنات کی صحیح ترین توجیہہ ہے، وہ زندگی کا صحیح ترین نظریہ ہے۔ جس دین کی یہ خصوصیات ہوں، اس کے بارے میں پہلی امید یہی کی جا سکتی ہے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں گے اور کوئی مصنوعی قسم کی حد بندی اس راستہ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو گی۔ اسلام کی اصل حیثیت کے اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس کی طرف لوگوں کا بڑھنا خود اپنے فائدے کی طرف بڑھنا ہے۔ پھر کون ہے جو جان بوجھ کر اپنے فائدے سے دست بردار ہو جائے۔

ایک گھنٹہ گھر کسی چوراہے پر تعمیر کر دیا جائے تو ہر شخص اس میں وقت دیکھتا ہے۔ اور اپنی گھڑیاں اس سے ملا لیتا ہے کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جن انجینئروں نے اس کو نصب کیا ہے۔ وہ ہندو تھے یا مسلمان، اپنے ملک کے رہنے والے تھے یا کسی دوسرے ملک کے یا یہ کہ جو گھڑی اسمیں لگائی گئی ہے وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے، ایشیا کی یا یورپ کی۔ صرف اس بات کا یقین کہ اس سے صحیح وقت معلوم کیا جا سکتا ہے، ہر شخص کو اسکی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی اصل حیثیت اگر دنیا کے سامنے بے نقاب کی جا سکے تو یقیناً لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس کی طرف مائل ہو گی۔ جیسا کہ ماضی میں مائل ہوتی رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کی موجودہ حیثیت کبھی بھی اس کی مستقل حیثیت نہیں ہوا کرتی ہندوستان

کے پہلے عام الکشن میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کو کانگریس کے بعد دوسری حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء کے الکشن میں پرجا پارٹی پیچھے چلی گئی اور کمیونسٹ پارٹی نے یہ حیثیت حاصل کر لی جو اس سے پہلے تیسرے نمبر پر تھی۔ اب جو حالات پیدا ہو رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹ بھی اگلے الکشن میں دوبارہ پیچھے چلے جائیں گے اور سوتنتر پارٹی ان سب سے آگے بڑھ جائے گی جو کہ ابھی جلد ہی وجود میں آئی ہے۔

یہی حال اسلام کا بھی ہے۔ آج اسلام کے ماننے والوں کا جو دائرہ ہے، اسی پر کل کے دائرے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دائرہ اسلام کے علمبرداروں کی کوشش سے بڑھ سکتا ہے اور ان کی نالائقی سے گھٹ سکتا ہے۔ اس کا تعلق ہماری اپنی کارکردگی سے ہے نہ کہ اسلام کے اصولوں سے۔

ہم ان شاء اللہ اس ملک کے تمام باشندوں کو اپنے مسلک پر متفق کرنے کی کوشش کریں گے اور اس کے لئے ہر قوم اور ہر فرقے کے پاس پہونچیں گے۔ مگر بطور ایک حقیقت ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہماری دعوت زیادہ تر مسلم ذہنوں کو اپیل کرے گی۔ اسلام کو اگر ایک بار بھی یہاں عملی شکل دی جا سکے، تو ہم کو یقین ہے کہ آبادی کا موجودہ تناسب باقی نہیں رہ سکے گا۔ اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائیگی، لیکن اس مرحلے کے آنے سے پہلے زیادہ تر وہی لوگ اس کی طرف بڑھیں گے جو پہلے سے اس کے حق میں عصبیت رکھتے ہوں۔ پہلے مرحلے میں ہم مسلمانوں کو اس مقصد کے گرد منظم کریں گے اور دوسرے فرقوں میں سے جو لوگ ہمارا ساتھ دینے کے لئے نکلیں گے ان کو اس تنظیم کا جزو بناتے چلے جائیں گے۔ یہ گروہ اگرچہ ملک کا ایک بہت بڑا گروہ ہوگا مگر عددی تناسب کے اعتبار سے پھر بھی وہ اقلیت ہی ہوگا۔ پہلے مرحلے میں اس سے زیادہ کی امید نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس کمی کو ہم جمہوریت کے رخنوں کے ذریعہ پوری کر سکتے ہیں۔

یہاں سے اب ہماری گفتگو دوسرے مسئلے پر پہنچ جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ کیا جمہوری انتخابات کے اس دور میں بھی اس کا امکان ہے کہ اقلیت، اکثریت کے مقابلے میں غالب آ جائے۔

میں موجودہ زمانے میں انتخابی طریق کار کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ الکشن، آج وہ آئینی میدان

جنگ ہے جہاں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ملک میں اگلے چند سالوں کے لئے امر و نہی کے اختیارات کسے حاصل ہوں گے۔ پہلے زمانے میں حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ کی جاتی تھی یا وہی عہدے کا تاج حاصل کرتا تھا مگر اب عوامی انتخابات اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کے پچھلے عام انتخابات میں یہ فقرہ نہایت جلی حرفوں میں لکھ کر تمام پبلک مقامات پر آویزاں کیا گیا تھا۔

"آپ کا ووٹ ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔"

یہ گویا نظامِ سلطنت میں اسی تاریخی تبدیلی کا اعلان تھا جو خود سلطنت کی طرف سے کیا گیا تھا۔

لیکن انتخابات کے معنی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پہلے زمانے میں اقلیتیں حکومت کیا کرتی تھیں۔ اور اب جمہوری انتخابات کے دور میں صرف اکثریت کو اس کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ملک میں اپنی حکومت بنائے۔ تو میں کہوں گا کہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ نظری طور پر جمہوریت کے معنی خواہ کچھ ہوں۔ مگر عملی دنیا میں بیشتر یہی ہوتا ہے کہ جمہوری حکومتیں اقلیت کی تائید سے بنی ہیں۔ دراصل انتخابی طریق کار میں کئی ایسے خلا موجود ہیں جن کی وجہ سے اکثر کسی اقلیت کو بھی غالب آجانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کامیابی کے لئے ملکی آبادی کے مقابلے میں عددی برتری حاصل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی گروہ کے اندر عمدہ تنظیم ہو اور اس کے افراد مواقع سے فائدہ اٹھانا جانتے ہوں تو وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود یقینی طور پر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے عام الکشن کے موقعہ پر ریاست کیرالا کی آبادی ایک کروڑ ساڑھے ستائیس لاکھ تھی۔ اور اس الکشن میں جن ووٹروں نے کمیونسٹ پارٹی کے حق میں رائے دی ان کی تعداد ۲۰۰۵۹۰۵۴۸ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی نے جتنے ووٹوں کی تائید سے حکومت بنائی ہے وہ ریاست کی کل آبادی کا صرف چھٹا یا ساتواں حصہ ہے۔

جمہوریت کے وہ رخنے کیا ہیں جن کی وجہ سے اقلیت کو اکثریت کے مقابلے میں حکومت بنانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چونکہ انتخابات میں صرف دو پارٹیاں حصہ نہیں لیتیں بلکہ بہت سی پارٹیاں اپنے نمائندے

کھڑے کرتی ہیں اس لئے ووٹ بہت سی پارٹیوں کے درمیان بٹ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ حقیقی اکثریت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ حصہ لینے والی مختلف پارٹیوں میں سے مقابلۃً کسی کو زیادہ ووٹ ملے ہیں۔ اس طرح اکثر کسی ایسی پارٹی کو حکومت بنانے کا موقعہ مل جاتا ہے جس کو اگرچہ رائے دینے والوں کی کل تعداد کی حقیقی اکثریت حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں اس کو زیادہ ووٹ مل جاتے ہیں مثلاً ۱۹۵۷ء کے عام الکشن میں کانگریس اور دوسری پارٹیوں کو ملنے والے ووٹوں کا تناسب سارے ملک میں حسب ذیل تھا:۔

کانگریس	۵,۷۰,۵۹,۱۴۴
دوسری پارٹیاں	۶,۰۴,۳۲,۹۲۸

گویا کانگریس کے حامیوں کے مقابلے میں اس کے مخالفین کی تعداد تقریباً چونتیس لاکھ کے بقدر زیادہ تھی۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے کہ اگر اسے کسی ایک مقام پر بسایا جائے تو لندن اور نیویارک کے بعد دنیا کا تیسرا سب سے بڑا شہر آباد ہو جائے گا۔ مگر یہ لوگ چونکہ متعدد پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگریس کے رائے دہندوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے مرکز میں اور ملک کی چودہ ریاستوں میں سے تیرہ میں اسی نے حکومت بنائی۔

۲۔ دوسری شکل جس میں ووٹروں کی قلت کے باوجود کسی پارٹی کو حکومت بنانے کا حق مل جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں اس کے کامیاب ہونے والے ممبروں کی تعداد زیادہ ہو جائے کیرلا اسمبلی میں کل ۱۲۷ نشستیں ہیں، جن میں سے ایک ممبر نامزد کیا جاتا ہے اور بقیہ ۱۲۶ ممبر الکشن کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں۔ پچھلے الکشن میں کانگریس نے ۱۲۴ حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ اور کمیونسٹ پارٹی نے صرف سو نشستوں پر مقابلہ کیا۔ جب ووٹنگ ہوئی تو ۵۹,۰۰,۲۸۹ ووٹروں نے اپنے ووٹ استعمال کئے۔ جن میں سے ۲۲,۱۰,۲۵۱ ووٹروں نے کانگریس کے حق میں رائے دی۔ اور ۲۰,۵۹,۵۴۸ ووٹروں نے کمیونسٹ پارٹی کے حق میں۔ یعنی کمیونسٹ پارٹی کے مقابلے میں ۱,۵۰,۷۰۳ ووٹ کانگریس کے زیادہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں ووٹ دینے والوں کی کل تعداد

ہیں سے ۳۷ ½ فیصدی نے کانگریس کی حمایت کی اور ۳۵ فیصدی نے کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دیئے اس طرح عددی اکثریت صریح طور پر کانگریس کو حاصل تھی مگر عملاً حکومت بنانے کا حق کمیونسٹ پارٹی کو دیا گیا۔ کیونکہ جو امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ وہ کانگریس کے ۴۴ اور کمیونسٹ پارٹی کے ۶۰ تھے۔

یہ وہ خلا ایسے ہیں جو خود انتخابی طریق کار میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ چیزیں اور ہیں جو حالات کے اندر موجود ہیں۔ جو اقلیت کو مزید یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اکثریت کے مقابلے میں آگے بڑھنے کی کوشش کر سکے۔

۳۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جمہوری ملکوں میں جو انتخابات ہوتے ہیں ان میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سارے ووٹر اپنا حق رائے دہندگی استعمال کرتے ہوں۔ جن ملکوں میں ڈکٹیٹرشپ قائم ہے۔ اور جہاں آدمی کو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ حکومت کی مرضی سے سارے کام کرنے ہوتے ہیں، وہاں تو ضرور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ تمام لوگ اپنے ووٹ استعمال کریں، تاکہ ڈکٹیٹرانہ حکومت پر جمہوریت کا لیبل لگایا جا سکے۔ چنانچہ روس میں جب الکشن کا تماشا ہوتا ہے تو ہمیشہ ۹۹ فی صدی سے زیادہ لوگ اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں۔ حال میں (۱۹۵۹ء کا وسط) جنرل ناصر نے مصر و شام (متحدہ عرب جمہوریہ) میں لوکل کونسلوں کا الکشن کرایا ہے جس میں کونسلوں کے ۹۴ ہزار ممبر منتخب کئے گئے ہیں۔ اس الکشن میں ہر ووٹر کے لئے ووٹ کا حق استعمال کرنا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ ورنہ اسے چودہ روپے کے قریب جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ مگر یہ چیز صرف ان ملکوں میں حاصل ہو سکتی ہے جہاں جبر کی حکمرانی ہو ورنہ عام لوگوں کو نہ تو ملک کی سیاست سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ کسی پارٹی سے۔ دوسرے عام الیکشن کے موقع پر کیرلا میں ووٹروں کی کل تعداد ۷۴۹۳۶۲۴ تھی۔ مگر عملاً جن لوگوں نے الکشن میں حصہ لیا، ان کی تعداد انسٹھ لاکھ ۹۱۸۹ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کے باشندوں میں سے سوا لاکھ کے قریب افراد نے ووٹ ہی نہیں دیئے۔ یعنی تقریباً اتنے ہی جتنے کہ اسرائیلی فلسطین میں آباد ہیں۔

یہی صورت حال سارے ملک میں پیش آئی۔ چنانچہ اس الکشن سے مرتبہ پہ ملک میں ووٹر ول

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

کی حقیقی تعداد انیس کروڑ تیس لاکھ تھی۔ مگر ان میں سے صرف گیارہ کروڑ، چوالیس لاکھ نوے ہزار ۵۷۲ نے اپنے ووٹ کو استعمال کیا۔ گویا سات کروڑ پچاسی لاکھ افراد نے ووٹر ہونے کے باوجود انتخابات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے جو پاکستان کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ اور براعظم آسٹریلیا کی آبادی سے آٹھ گنا زیادہ ہے۔ —— اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک گروہ عددی لحاظ سے پیچھے ہونے کے باوجود اگر اس اعتبار سے اکثریت سے آگے بڑھ جائے کہ اس کے تمام مرد عورت اپنے ووٹ کو استعمال کریں تو اس کی وجہ سے الکشن کے نتیجے میں کس قدر فرق واقع ہو جائیگا۔

۴۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی دستور کی دفعہ ۳۲۶ کی رو سے ہندوستان کا ہر وہ شہری جس کی عمر اکیس سال ہو ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے۔ مگر یہ حق صرف اس وقت قابل استعمال ہوتا ہے جب کہ اس شخص کا نام سرکاری رجسٹر میں درج ہو چکا ہو۔ جو شخص پہلے سے درج فہرست نہ ہوا ہو وہ کسی کو ووٹ نہیں دے سکتا۔

یہ درج رجسٹر ہونے کی شرط انتخابی طریق کار میں مزید ایک خلا پیدا کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ووٹ دینے والوں کی جو فہرستیں بنتی ہیں وہ عام طور پر نہایت ناقص رہ جاتی ہیں۔ سرکاری کارکنوں کی نااہلی اور عوام کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ان میں بہت سے ووٹر درج نہیں ہو پاتے۔ ہندوستان کے پچھلے دونوں الکشن کے موقعوں پر درج فہرست ووٹروں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

۱۹۵۱ء	۱۷ کروڑ ۴۵ لاکھ
۱۹۵۷ء	۱۹ کروڑ — تقریباً

ووٹروں کی یہ تعداد ملک کی کل آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس ایسے اعداد و شمار نہیں ہیں جن سے معلوم کیا جا سکے کہ مذکورہ بالا دونوں سالوں میں ووٹ دینے کے قابل افراد کی صحیح تعداد سارے ملک میں کیا تھی۔ مگر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ بالغ حق رائے دہی کے عام اصول کو اختیار کرتے ہوئے کل آبادی کا صرف نصف حصہ ووٹ دینے کے قابل ہوگا۔ یہ غلطی ہے کہ موجودہ فہرستوں میں بہت سے لوگ درج ہونے سے رہ جاتے ہیں —— اس کے

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی اشاعت

معنی یہ ہیں کہ اگر اقلیت اس اعتبار سے اکثریتی فرقے سے آگے بڑھ جائے کہ اس کے اندر ووٹ دینے کے قابل جتنے مرد اور جتنی عورتیں ہیں، وہ کوشش کرکے ان سب کو درج فہرست کرالے تو یہ چیز انتخابی دنیا میں اس کے تناسب کو اس تناسب سے بڑھا دے گی جو کہ مردم شماری کی رو سے اسے ملک میں حاصل ہے۔

یہ موجودہ جمہوری نظام کے چند بالکل نمایاں رخنے ہیں۔ جن سے اگر کوئی تحریک فائدہ اٹھا سکے تو وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اقتدار پر قبضہ کر سکتی ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ "جمہوریت کے رخنے" ہم کو تسلیم ہیں۔ مگر ان پر زیادہ دیر تک اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ہندوستان میں تعلیم کی کمی اور اس کے ترقی یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جیسے جیسے یہ صورت حال دور ہوگی، لوگوں کے اندر سیاسی شعور آتا جائے گا۔ جمہوریت کے یہ رخنے بھی ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس وقت آپ کیا کریں گے۔

اس اعتراض کی غلطی اس وقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ خود "ترقی یافتہ" ملکوں میں بھی جمہوریت کا یہی حال ہے۔ مثلاً برطانیہ کے ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں آٹھ ملین ووٹروں نے اپنا ووٹ استعمال نہیں کیا۔ جو رائے دہندگان کی پوری تعداد کا ۲۵ فیصدی حصہ تھے۔ ۱۹۴۶ء میں امریکی کانگریس کے انتخاب میں صرف ۳۹ فیصدی آدمیوں نے اپنے ووٹ دیئے۔ اور یہ اس کے باوجود ہوا کہ سارے امریکی پریس نے الکشن کے لوگوں کو ابھارنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی تھی۔

امریکہ میں ۱۹۴۴ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ جس کا نام ہے۔ (DEMOCRACY BEGINS AT HOME) اس کتاب کا مصنف ایک امریکی صحافی جیننگس پیری (JENNINGS PERRY) ہے اور اس میں امریکہ کی بعض ریاستوں میں ہونے والے انتخابات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق ریاست ٹینسی (TENNESSEE) میں ۱۹۳۸ء میں ریاست کے گورنر کے لئے جو الکشن ہوا تھا، اس وقت ریاست میں ووٹروں کی کل

تھی اور بارہ لاکھ تھی ۔ مگر عملاً صرف تین لاکھ باون ہزار آدمیوں نے ووٹ دیئے ۔ مصنف نے جمہوریت کی اس قسم کی خامیوں کو گنانے کے بعد لکھا ہے کہ :-

"ہم بہت تیزی سے ایک ایسے طرز حکومت کی طرف لوٹ رہے ہیں جس کو صرف چند آدمی منتخب کرتے ہیں ۔"

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو غالب کرنے کے صریح امکانات موجود ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ امکان ان ملکوں سے کہیں زیادہ یہاں پایا جاتا ہے جو مسلم اکثریت کے ممالک کہے جاتے ہیں ۔ مسلم ممالک ابھی شخصی حکمرانی کے دور سے گزر رہے ہیں ۔ ان ملکوں میں کوئی نہیں جانتا کہ کب فوجی افسران بغاوت کر کے تمام تحریکوں کو ختم کر دیں گے ۔ اور ایک حکومت جو آئینی طور پر منتخب ہو کر برسر اقتدار آئی ہو اس کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیں گے ۔ اس کے برعکس ہندوستان میں جمہوریت کافی ترقی کر چکی ہے ۔ یہاں ایک جمہوری دستور کے تحت کھلے میدان میں مقابلہ ہوتا ہے ۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

اور جیسا کہ میں نے بتایا، جمہوریت اگرچہ نظری طور پر اکثریت کی حکومت کو کہتے ہیں مگر اس کا جو عملی طریق کار ہے وہ اس قسم کا ہے کہ ایک اقلیت کے لئے بھی اس بات کا پورا موقع ہے کہ وہ کوشش کر کے اقتدار پر قبضہ کر سکتی ہے اور ایک ایسی حکومت جو آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے پر کام کرنے والی ہو۔ اس کو اگر ملک کی کسی ایک ریاست میں بھی پانچ سال تک کام کرنے کا موقع مل جائے تو اس کے بعد کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کے اقتدار کو سارے ملک تک وسیع ہونے سے روک سکے۔ اسلام کی فطرت میں پھیلنا ہے۔ وہ صرف اس وقت بیٹھتا ہے جب کہ وہ اسلام نہ رہے بلکہ کچھ اور ہو جائے۔

اس سلسلے میں یہ بات ہمارے لئے ایک اچھی علامت ہے کہ ہندوستان اگرچہ ایک مذہبی ملک ہے مگر اجتماعی لحاظ سے وہ بڑی حد تک افادی ذہن رکھتا ہے۔ وہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے اور جو بھی اس کو ان مسائل کے حل کا یقین دلا دے، وہ اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بارہ سال گزرنے کے بعد بھی مذہب کا نعرہ لگانے والی جماعتیں یہاں کی سیاست میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں کر سکیں جو سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کو حاصل ہے —— اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اسلام کے غالب آنے کے کس قدر مواقع ہیں جس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ سارے انسانی مسائل کا حل ہے اور اس کے سوا کوئی بھی نظام انسانی مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

اس پوری صورت حال کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اسلام کو غالب کرنے کے لئے اصل سوال تعداد کا نہیں ہے بلکہ جو تعداد موجود ہے اس کے ارادہ کر لینے کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں کامیاب ہونے کے لئے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے —— امت مسلمہ کا اس مقصد کے لئے اٹھ کھڑا ہونا۔ اگر یہ واقعہ وجود میں آسکے تو لازمی طور پر دوسرا واقعہ وجود میں آئے گا۔ اور کوئی طاقت خدا کے دین کے آگے بند بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ ہمارے لئے اس بات کے قطعی امکانات موجود ہیں کہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی پیغام کو اپنے ماحول کے اندر عملی شکل دے سکیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لئے تیار ہے۔ دنیا اپنے سارے مواقع کے ساتھ امت مسلمہ

کی ایک ایسی کوشش کا انتظار کر رہی ہے جو اسے لازمی طور پر کامیابی تک پہنچا دے گی۔ یہ حالات کا فیصلہ ہے اب امت مسلمہ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حصے کا فرض ادا کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے یا نہیں۔ مستقبل پکار رہا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو اس پکار کا جواب دینا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے جو دین بھیجا وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وہ عبادت کے طریقے بتاتا ہے اسی طرح سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے۔ اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے۔ اتنا ہی تعلق اس کا حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو عملاً جاری و نافذ بھی کر دیا۔ اس وجہ سے حضورؐ کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکی نفوس اور ایک معلم اخلاق کے ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے۔ اس طرح بحیثیت ایک ماہر سیاست اور ایک مدبر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔ میں ....
.... حضورؐ کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔

اس امر واقعی سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مورخ علامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ ان پر نراج اور انارکی کا تسلط رہا۔ پوری قوم جنگ جو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی۔ جس کی ساری قوت و صلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہو رہی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور، قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں، جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج فرار پسندی کے لئے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا خود قرآن نے ان کو قوماً لُدّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم - اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر دیتے جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے -

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کرکے دور ہو گئے . یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ ہو گئی - یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہو گئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم اور اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں، بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہونچ گئی - اور اس نے بلا استثناء دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست اور جہاں بانی کا درس دیا -

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی، اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا۔ نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے یا بڑے مدبر اور سیاست داں گزرے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی لیکن آپ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا۔ اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپؐ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف اعلائے کلمۃ اللہ

اور خوف آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ آپ کی کوشش سے ایک بہترین امت ظہور میں آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (تم دنیا کی بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے اٹھائے گئے ہو۔)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اٹھے اگرچہ وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آ جاتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں، نہ دوست کے مقابل میں۔ آپؐ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا، ایسے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں موم پڑ جاتا لیکن آپ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپؐ کے سامنے پیشکشیں بھی کی گئیں اور آپؐ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سوجھانے کی کوشش کی گئی لیکن اس قسم کی تدبیریں اور کوششیں بھی آپؐ کو آپؐ کے کسی موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قایم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاست داں کا نشان آپ نہیں دے سکتے جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہو سکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کمزوری نہیں دکھائی۔ یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ لیکن حضورؐ نے ایک پورا نظام زندگی کھڑا کر دیا۔ جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ کہتے تھے لیکن حضورؐ نے اس نظام زندگی کو عملی دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ حضورؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے وہ خود

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش۔۔

دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے متعین کردہ اصولوں کے لئے بھی اپنے اصولوں کی قربانی کبھی نہیں دی۔ اصولوں کے لئے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کئے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کئے گئے لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لئے تھی تو اس کا معاملہ اور تھا، وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد ختم ہو گئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی۔ لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپ کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت بھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کر لی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن بھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دے دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے۔ عہد شکنیاں کرے۔ لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانہ میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ حتیٰ کہ اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھہراتا ہے۔ اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن ایک سیاستدان اور مدبر یہی سارے کام اپنی سیاسی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لئے کرے تو یہ سارے کام اس کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی پکڑ نہیں ہوتی۔ اور مرنے کے بعد بھی اپنے انہی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لئے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ ان باتوں میں شدید ہوتے تھے وہی لوگ ابھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور

سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے بلکہ آپؐ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلہ میں ایک صاحب اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھوٹ کو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہیں زیادہ سنگین قرار دیا۔ آپ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپؐ کو پیش آئے جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپؐ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپ کو حریفوں اور حلیفوں دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے۔ دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں۔ عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے۔ آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں اور سیاسی گفتگوؤں کے لئے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے، بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپؐ نے انجام دیئے۔ لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا۔ کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا، اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہل سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی اس دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا، اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجئے یا حکمت نبوت سے۔

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپؐ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشہ میں امن و عدل کی حکومت قائم کر دی، کفار و مشرکین کا زور آپؐ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپؐ نے خاتمہ کر دیا۔

ر میوں کی بہتری کے لیے بھی آپ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے۔ لیکن پھر بھی انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے۔ اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور مال واسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی جو اس ساری جد وجہد کے دوران میں حضورؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں - لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس تہذیب وتمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھر دی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے کسی کے ناموس پر دست درازی کی ہو۔

اہل سیاست کے لیے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لئے اٹھتے ہیں وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی اہمیت قائم کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس طرح کے مقاصد کے پیش نظر جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں۔ جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اترتے ہیں ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں

ایڈریس پیش کئے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لئے قصر و ایوان آراستہ کئے جاتے ہیں۔ ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں، ان کے لئے بری، بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کئے جاتے ہیں، جب کبھی وہ کسی سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لئے بند کر دی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحب سیاست کا تصور نہ دوسرے لوگ ہی کرتے ہیں اور نہ کوئی صاحب سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی تصور کرتا۔ لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ رہے جب آپ اپنے صحابہ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں، مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ کون ہیں، کھانا کھانے کے لئے بیٹھتے تو دوزانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر جو حضور کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہوگا۔ سامنے آیا تو حضور کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا۔ اس طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپ کے لئے کوئی خاص سواری تھی۔ نہ کوئی خاص قصر و ایوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپ جو لباس دن میں پہنتے اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور صبح کو وہی لباس پہنے ہوئے ملکی وفود اور سفراء سے مسجد نبوی کے فرش پر ملاقاتیں فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹھ باٹھ سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ جس طمطراق اور جس ٹھاٹھ باٹھ کی وہ اب عادی ہو گئی ہے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہل سیاست کی تماشا ہی ہمیشہ سے یہی رہی۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں دنیوی کروفر کے بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹھ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش،

باتھ کی جگہ خدمت اور محبت کا جال تھا۔ لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم و شام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارک ہی میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصل مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضور کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا اور دیکھتے دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین بر اعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جما لیں لیکن اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لئے موزوں اشخاص و رجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے۔ بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار و قہار شاہنشاہتیں تھیں لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا۔ گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہل سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجئے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں۔ جن معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابہ تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم۔

کائناتِ عالم کی ایک عجیب اور دل پسند خوشبو

عطر مجموعہ

پھولوں کی خوشبو کا یہ بے نظیر اور لاجواب مجموعہ، عطروں کا سرتاج ہے۔ جس کی خوشبو سے شاہی محل اور جھونپڑے یکساں مہک رہے ہیں۔ پاکیزگی کے تمام لوازمات کے ساتھ ہندستان کا کوئی عطر فروش اتنا اچھا اور سستا عطر پیش نہیں کرسکا آپ بھی ایک مرتبہ آزما لیجئے۔

رجسٹرڈ ٹ۔م ۳۹۱۸ دیکھکر اصلی مال خریدیئے نقلی مال سے بچیے

نوٹ:۔ آپ ہمیشہ مال خریدتے وقت ہمارے یہاں کی سیل بند شیشیاں خرید فرمائیے۔ اور خریدنے سے قبل ٹریڈ مارک اور سیل دیکھکر خریدیئے تاکہ آپ کو اصلی مال مل سکے۔ نقالوں سے ہوشیار رہیے۔

ہیڈ آفس: حافظ محمد زکریا اینڈ برادرس پرفیومرس بمبئی ۳

برانچ نمبر ۱ مینارہ مسجد۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

〃 نمبر ۲ صابو صدیق مسافر خانہ، کرناک بندر روڈ بمبئی ۱

ہجرتِ نبوی اور اس کے نتائج ۔ بقیہ ص ۱۰۹ ۔

لیکن حالتوں میں بون بعید ہے ۔ آج ہم مالی، عددی اور وسعت زمین اور اسباب و متاع کے لحاظ سے بہت آگے ہیں ۔ ہماری معاصر دو قوتوں میں سے ایک قوت جس قدر اقتصادی اسباب و ذرائع کے منبع پر بنائے ہے ۔ ہمارے پاس اس سے زیادہ ہیں ۔ لیکن باوجود اس کے آج ہمارا کوئی شمار و قدر جہاں میں نہیں ہے ۔ اور میزانِ عالم میں ہمارا کوئی وزن نہیں ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اس عقیدہ و ایمان سے عاری ہیں جو حضرت محمدؐ اور آپ کے ساتھیوں میں تھا ۔ وہ ایمان ہی کا وزن تھا کہ ایک پلڑے میں دو دو قومیں تھیں ، دوسرے میں مسلمان تھے اور مسلمانوں کا پلڑا جھک گیا ۔ ہم برائے نام مسلم و مومن ہیں ۔ ہم میں اختلاف گمراہی شرک ساری بیزاریاں آگئی ہیں ۔ ایسے میں ہم محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی طرح اپنی شخصیتوں کو خاک اجاگر کر سکتے ہیں ذرا سوچیے ڈوبتا ہوا شخص ڈوبتے کو کیسے نجات دلا سکتا ہے اور جس میں فساد ہو ، وہ اصلاح کیسے کر سکتا ہے ؟

لیکن ہمارے دل میں یہ دیکھ کر امید کی روشنی پھوٹ پڑی ہے کہ آج اتحاد عالم اسلامی کی حقیقت جلوہ گر ہو رہی ہے ۔ اب قدرتی طور پر اہل اسلام اپنی بقا کا اہتمام کر رہے ہیں اور جس طرح مغرب کی استعماریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا جس کی وجہ سے مغرب کا سایۂ اقتدار مٹتا جا رہا ہے اسی طرح آج ہماری صف میں جو عالم اسلامی کے خلاف عزائم رکھنے والے اشتراکی گھس آئے ہیں ان سے دو بدو ہم نمٹ لیں گے ، ہم سیاسی اقتصادی ، تجارتی ، فوجی اور مالی استقلال و آزادی چاہتے ہیں ۔

مغربیت سے بچنا اور اشتراکیت کی طرف دست قبول دراز کرنا ایک مجنونانہ حرکت ہے کیونکہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے مغربی استعماریت سے زیادہ قبیح اشتراکی استعماریت ہے ۔ اشتراکیت کعزوخست ، انسانیت کشی اور طوق غلامی ڈالنے میں اپنی مثال آپ ہے اس نے تو انسانیت کے محل کو منہدم کر کے انسانوں کو ایک حیوان بنا کر رکھ دیا ہے جس میں کوئی حس و ادراک نہ ہو ۔

ہم ہجرت مقدس کا تذکرہ بار بار ہمیشہ کرتے رہیں گے ۔ کیونکہ یہ ہمارے اندر نفس و روح کی تطہیر کی قوت پیدا کرتی ہے اور اس کی زمین کو آبادی اور امن کا پیغام دیکر موجودہ دور کے انسانوں میں یہ حرکت

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش ۔

پیدا کرتی ہے کہ ہم خوف، جہالت اور مرض سے انسانوں کو مامون رکھنے کی ذمہ داری لیں۔

ہجرت ہماری موجودہ زندگی کے لئے ایک مفید ترین درس عبرت ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے رب پر کامل یقین رکھیں اور اس نے اپنے برحق بندوں کی مدد کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کو سچ یقین کریں۔ ہم اگرچہ کمزور ہیں لیکن ہم رسول اللہ کے زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ کمزور نہیں ہیں۔ لیکن شرط اول یہ ہے کہ ہمارے دل ایمان سے معمور ہو جائیں۔

ذرا غور کیجئے مسلمان مکہ سے خفیہ طور پر ڈر کر بھاگے تھے اگر ایسی صورت میں ان کا دل حقیقی ایمان سے معمور نہ ہوتا تو وہ اس نئے نظام الٰہی میں شک کرنے لگتے۔ ہائے شک یہی ہو جاتی کہ رسول اللہ نے تو قیصر وکسریٰ کی حکومت دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب ان کی عاجزی کا حال یہ ہے کہ مشرکین سے دو بدو بھڑنے کی قوت نہیں۔ کمزوری کا یہ عالم کہ اپنے ساتھی ابوبکر کو لیکر مخفی طور پر مدینہ بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ سب صورتیں دیکھکر اگر مومنوں کا ایمان کامل نہ ہوتا تو شک پیدا ہو جاتا لیکن وہ لوگ اپنے اللہ، اللہ کے رسول اور اس کے دین پر سچا یقین رکھتے تھے۔ یہ یقین یاس و ناکامی میں بھی ان کو پورا پورا تھا۔ پس اللہ نے ان کو اس کا پھل یہ دیا کہ اگرچہ رسول اللہ عاجز ہو کر روپوش ہو گئے لیکن انھیں یقین و ایمان رہا کہ اللہ کے رسول ہی حق پر ہیں اور اللہ کا وعدۂ نصرت حق ہے اگرچہ بعض لوگوں کو تاخیر نظر آرہی ہے۔

ہجرت کا اثر رسول اللہ اور مسلمانوں پر ہی نہیں بلکہ خود قرآن کریم پر بھی ظاہر ہوا۔ چنانچہ ہجرت سے قبل مکہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں انبیاء سابقین کے قصے ہیں مقصد یہ تھا کہ ابتدائے امر میں رسول اللہ کو اور مومنوں کو ایثار و قربانی، بہادری و صبر کی تعلیم دی جائے تاکہ دعوت اسلامی میں اس قدر پختہ ہو جائیں کہ کوئی یاس وشک ان کے دلوں تک پھٹک نہ سکے۔ نیز کفر و شرک سے نفرت دلاکر توحید و دین اور ان کے حقائق و معارف سے روشناس کرانا ان سورتوں کے نشانے تھے۔

لیکن مدینہ میں ہجرت کے بعد جن سورتوں کا نزول ہوا ان کا انداز ارشاد دوسرا ہے۔ چونکہ ہجرت نے انصار و مہاجرین وغیرہم کو مجتمع کر دیا اور تعلقات کی وسعت اتنی ہوئی کہ اس وقت کے غیر مسلموں، یہودیوں عیسائیوں سے بھی علاقے قائم ہوئے اس طرح مسلمانوں کا ایک انوکھا اجتماع ہو گیا۔ اس لئے رسول اللہ

کا پیغام زمانہ دراز تک باقی رکھنے کے لئے ضروری ہوا کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ کی اس طرح تربیت ہو جائے کہ وہ اسلام کا عالمی سرمایہ ہوں اور ایک قندیل بن کر عرصۂ دراز تک روشنی پھیلاتے ہوئے آگے بڑھیں اس طرح کی جماعت کے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام انسانیت کبریٰ کے نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔

مذکورہ بالا بہت سے امور ہجرت سے قبل مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل تھے ہجرت کے بعد انھوں نے محسوس کیا چنانچہ اب ضروری ہو گیا کہ نظام اور حکومت کے اصول و قواعد کی جستجو کریں بنا بریں مدینہ میں اب قرآن کا نزول شروع ہوا قرآن حکومت، نئی اجتماعیت، نئی قومیت اور افراد کے باہمی تعلقات کے قواعد و ضوابط بنانے میں جن چیزوں سے مدد مل سکتی تھی ان کا نزول ہوا۔ اور رسول اللہ ہجرت سے قبل ارشاد و تبلیغ کے لئے وقف تھے لیکن اب نئے اعمال کی ابتدا فرمائی یعنی مسلمانوں کی سیاست، شریعت، مرکز کی تنظیم، افراد و جماعت کی تنظیم، اقتصادیات، اعانت، امامت اور ذرائع منافع کی تنظیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر آنے والے ہنگامی حالات و انقلابات کی طرف توجہ فرمائی۔

حضرت عمرؓ اور تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر اسلامی تاریخ کی ابتدا ہجرت سے کی ہے تو اس میں بھی یہی راز ہے کہ اگرچہ اسلام میں بڑے بڑے تاریخی ایام آئے لیکن اس کے لئے ہجرت ہی کا دن اس لئے مقرر کیا گیا کہ یہ تمام ایام سے ممتاز یوم ہے۔ رسول اللہ کی بعثت کا دن، عقبہ کا دن، بدر و حدیبیہ کا دن فتح مکہ اور حجۃ الوداع کا دن جب کہ الیوم اکملت لکم دینکم کا پیغام ملا۔ یہ سب ایام اسلام کے تاریخی دن ہیں لیکن نتائج کے لامحدود دگرشوں کے لحاظ سے ان سب میں ہجرت کا دن ہی اس قابل ہوا کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا اسی دن سے ہو۔ شاید بعض لوگ حیرت کریں کہ محمدؐ کے فرار کے دن کو نصرت، ہجرت، اقتدار و فتح کے ایام کو نظر انداز کر کے کیوں اتنی اہمیت دی گئی۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اگرچہ ہجرت ایک فرار تھی اور قریش کی سطوت کے مقابل یہ ایک ظاہری شکست تھی، مگر ہمیں ہجرت کے ان نتائج سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے جن کا ذکر اوپر کی تحریر میں ہوا ہے ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ فرار ہر حال میں معیوب نہیں ہے ہجرت میں جو فرار کی نوعیت و مصلحت ہے وہ معیوب نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک بڑی فضیلت و برتری کی چیز ہو گئی

ایک بہادر و دانا شخص جب کارزار سے فرار اس لئے اختیار کرے کہ پوری قوت اور ساز و سامان کیساتھ پھر حملہ کرنا ہے تو یہ چیز اس کے لئے بجائے عیب کے منقبت ہو جاتی ہے۔ مورخ عالم اگر ہجرت کے نتائج ظاہر ہونے سے قبل ہجرت کو فرار و شکست کا نام دے تو اس کی کچھ گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جب اس کے عظیم المرتبت نتائج تاریخ انسانی کا سنہرا باب بنکر آنکھوں کے سامنے آ گئے تو اب ہجرت کو فرار شکست کا نام دینے کی قطعاً گنجائش نہیں اور یہ عقل و عدل کے خلاف چیز ہوگی۔ دانشمندی کی بات تو یہ ہے کہ ہجرت کو اس کے دنیا کا رخ موڑ دینے والے اور انسانی زندگی پر گہری چھاپ لگانے والے نتائج ظاہر ہونے کے بعد دیکھیں کہ اقدام ہجرت فرار و شکست تھا یا کچھ اور۔

ہجرت دو عہدوں کے مابین ایک نقطۂ امتیاز ہے اور کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ہجرت سے انسانیت کو وہ فائدہ پہونچا جو مکہ میں رہنے اور منفی مدافعت کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہجرت کے بعد کے نتائج نے ثابت کر دیا، یہ دن اسلامی تاریخ میں سب سے عظیم دن ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضرت عمرؓ، حضرت علی اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس دن کو سن اسلامی قرار دیکر دائمی زندگی کے قابل نہ بناتے۔

ہمیں چاہیئے کہ ہجرت کی یاد ہمیشہ باقی رکھیں اور ہجرت نے ہمارے اسلاف کو جو پیغام دیا وہی پیغام اپنے لئے بھی محسوس کریں۔ اس طرح ہم اپنے اسلام کو انسانیت کبریٰ کی فلاح کے لئے بہترین شے قرار دے سکتے ہیں اور وہ کام کر سکتے ہیں جو کسی قوت و حکومت اور کسی نظام نے نہیں کیا۔

ہمارے موجودہ اضطراب و بے چینی کے لئے ہجرت کی یاد اطمینان و سلامتی کا پیغام ہے۔ اس کی یاد عمل صالح میں مساعد ہوگی۔

آخر میں ہم عزم مصمم، صدق نیت اور حسن عمل کی پونجی لئے ہوئے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی توفیق رفیق عطا ہو اس کی مدد شامل حال ہو تاکہ جسطرح اس کی مدد سے اسلاف کا حال ہجرت کے بعد بدل گیا تھا۔ اسی طرح ہمارا حال بھی تبدیل ہو، ہم کو بھی ضعف کے بعد قوت، اختلاف و تفرقہ کے بجائے اتحاد و اجتماعیت اور شقاوت کے بجائے دارین کی سعادت نصیب ہو۔ اللہ دعاؤں کو سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش۔

سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

نام محمدؐ

(از کبیر داس)

کبیر داس نے یہ عجیب قطعہ کہا کہ ان کے بتائے ہوئے قاعدہ سے دنیا کے تمام الفاظ و جملوں سے "محمد" کا عدد (۹۲) برآمد ہوگا گویا دنیا جہاں کی کوئی چیز نام محمدؐ سے خالی نہیں، قطعہ یہ ہے۔

قطعہ

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کر لو وائے   دو ملا کے پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے نوگن کر لو دو اس میں دو اور ملائے   کہت کبیر سنو بھئی سادھو نام "محمد" آئے

تشریح جو لفظ بھی آپ فرض کریں اس کے عدد بحساب ابجد نکال لیجئے پھر اس عدد کو چار سے ضرب دیجئے حاصل ضرب میں ۲ عدد ملا دیجئے پھر اس حاصل جمع کو پانچ سے ضرب دیجئے اور پھر اس حاصل ضرب کو بیس سے تقسیم کر دیجئے۔ تقسیم کے بعد جو عدد باقی بچے اس کو ۹ سے ضرب دیجئے اور پھر حاصل ضرب میں ۲ عدد ملا دیجئے بس اس وقت جو عدد حاصل ہوگا وہ ۹۲ کا عدد ہوگا جو کہ محمد کا عدد ہے۔ اس طرح کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عددوں والے جس حرف و لفظ سے بھی آپ تجربہ کریں بالکل صحیح پائیں گے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیش کش

رسولِ کریمؐ کی جنگی اسکیم

از:- عبدالباری ایم۔اے

جنگ اور جنگی اسکیم سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں! تفصیلات کا مطالعہ خود بتاتا ہے کہ جنگوں کا سلسلہ رسولِ کریمؐ کے اُسوۂ حسنہ کا ایک اہم اور نہایت ہی سبق آموز باب ہے۔ کیوں؟ اور کیسے؟

آپؐ کی جنگوں کی نوعیت اور وجوہ

امریکہ کے ایک مصنف (Albert Marrey) (البرٹ مرے) نے جو گذشتہ دو جنگوں کا تجربہ کار ہے اپنی تصنیف Psychology of war & peace (سائکالوجی آف وار اینڈ پیس) میں لکھا ہے کہ "تاریخ اور قوموں کا نفس مزاج اس حقیقت کو ہمیشہ جھٹلاتا رہا ہے کہ کسی قوم کی کم تعداد اس کی کیفیت کو بھی گھٹا دیتی ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت۔ جنگ میں کامیابی۔ اخلاقی اور سیاسی غلبہ اور قومی عظمت کے لئے بڑی تعداد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی جماعت کثیر تعداد پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ تھوڑے لوگ بڑی بڑی فوجوں کو مار بھگاتے ہیں۔ ایک معمولی گروہ بڑے گروہ کو زیر کر لیتا ہے۔ در اصل تعداد کسی وقت بھی فیصلہ کن جوہر ثابت نہیں ہوتی۔ مقصد برآری اور کامیابی کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اگر تھوڑی تعداد میں پائے جائیں تو میدان ان ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جو جاذ تھوڑی تعداد کو حاصل ہوتا ہے وہ بڑی تعداد میں پیدا نہیں ہو سکتا۔"

ماہرِ جنگ و ماہرِ نفسیات کے ان الفاظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہی بات تقریباً ۳ ہزار برس پہلے طالوت (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ ق م) کے آدمیوں نے کہی تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے کہ جب طالوت اور اس کے ساتھیوں نے کہدیا کہ آج ہم میں جالوت اور اُس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انھوں نے کہا "کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝" (البقرۃ ۲ پارہ) ایسا

ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اِذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے) ۔۔۔ آخر کار انھوں نے کافروں کو شکست دی اور اُن کی فوج کے ایک نوجوان داؤد (داؤد اس وقت کم سِن نوجوان تھے) نے زبردست پہلوان جالوت کو بھی قتل کر دیا۔

صرف فرق یہ ہے کہ ماہرِ نفسیات عناصر کو ضروری قرار دیتا ہے اور قرآن اُسے 'اِذن اللہ' اور 'صبر' کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔۔۔ یہ اعتقاد کہ اگر صبر پر قرار رکھا جائے تو خدا اپنے کمزور بندوں کو حق کی راہ میں ہمیشہ غالب رکھتا ہے۔ ایک مومن کے اندر ضرور قوتِ جہاد اور استقامت پیدا کر دیتا ہے ۔۔۔ اُسی اللہ نے جس کے اِذن سے یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے دشمن سے مقابلہ کے لئے ہر امکانی قوت کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ جنگِ بدر کے بعد ہی ایک آیت کے نزول سے اس کی تائید ہو جاتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اور واقعات خود شاہد ہیں کہ باوجود پیغمبر ہونے کے جنھیں اللہ کی ساری تائید حاصل تھی، آپ نے حربی تدابیر سے بھی کام لیا۔

رسولِ کریمؐ کی سوانحِ عمری ایک حیثیت سے غزوات ہی کا نام ہے (بلکہ ان میں سے بعض کا حوالہ قرآنِ کریم میں اس انداز سے آیا ہے کہ اُن کا ذکر مومن کی تربیت و پختگی کے لئے انمول ذریعہ ہے) اور اسی لئے پہلے سیرت کی کتابیں 'مغازی' (غازی کے افعال) کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ مگر آپ کی جنگیں تاریخِ انسانی میں غیر معمولی طور پر ممتاز ہیں! اکثر دگنی تگنی اور بعض وقت دس گُنی قوت کے مقابلہ میں بھی آپ ہی کو قریب قریب ہمیشہ فتح حاصل ہوئی۔ دورانِ غزوات سات آٹھ سال کی مدت میں اتنی کم جانیں ضائع ہوئیں کہ انسانی خون کی یہ عزت بھی تاریخِ عالم میں بے نظیر ہو جاتی ہے! آخر یہ جنگیں کیوں اتنی ممتاز و بے نظیر ہیں؟ اُن کی نوعیت کیا ہے؟ ان جنگوں میں کیا کیا حربی تدابیر اختیار کی گئیں؟ کامیابی کا راز کیا تھا؟ دراصل ان ہی باتوں کو تفصیلات میں نمایاں کیا جائے گا تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

رسولِ کریمؐ نے مکہ سے توحید کی دعوت دینی شروع کی۔ اسلامی دعوت کا یہ اعلان سب سے زیادہ قریش کے لئے پریشانی کا موجب تھا۔ اُس وقت مکہ کی عزت کعبہ کی وجہ سے تھی اور قریش کا خاندان کعبہ کا مجاور اور متولی تھا۔ یہ بلادِ ملک کے عام بُت پرستانہ موروثی رسم و رواج کے خلاف تھا۔ پھر اس دعوت کے پھیلنے

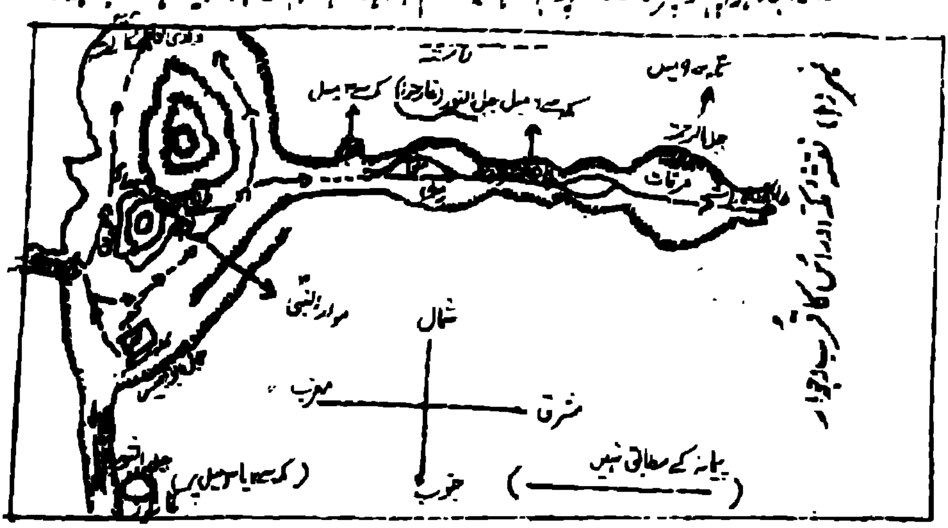
پہنچنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کو سارا اقتدار مٹی میں مل جائے اور ان کی مذہبی قیادت اپنے آپ ختم ہو جائے۔

دوسری طرف عرب کی قومی زندگی میں جنگ و غارت گری سرایت کر گئی تھی۔ عرب ایک ویران ملک تھا۔ بھیڑ بکریوں کے علاوہ اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ تھا اور بعض بعض کے پاس یہ بھی نہ تھا۔ اس لئے حملہ اور غارتگری شروع ہوئی اور یہی معاش کا تنہا ذریعہ قرار پایا۔ غارتگری کے بعد تجارت کا نمبر آتا ہے۔ لیکن تجارتی قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا محال تھا۔ تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے صرف حج کے ایّام میں مذہباً خاموش ہو جاتے۔ اس کے علاوہ ثار (بدلہ) کا قانون تھا۔ کسی مقتول پر اس کے قبیلہ کو انتقام لینا فرض ہوجاتا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں برس گزر جاتے مگر لڑائیاں مسلسل قائم رہتیں۔ ان کے علاوہ قریش میں بہت سی بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور اسلامی تحریک نے ان برائیوں کا کھل کر استیصال شروع کر دیا۔

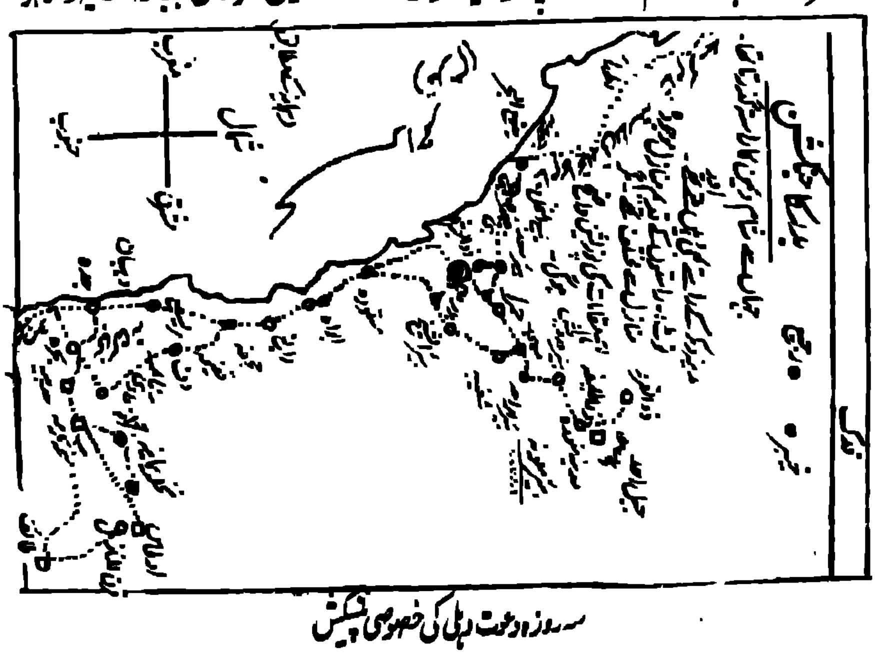
انہی اندیشوں کی بناپر کعبہ میں توحید کا اعلان ہوتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخلص محافظ پر چاروں طرف سے اتنی تلواریں پڑیں کہ وہ شہید ہوگئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلی شہادت تھی۔ اللہ کے فضل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے۔ غفار کا قبیلہ اس راستہ پر تھا جس سے ہو کر قریش ملکِ شام کو تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اسی قبیلہ کے ایک شخص حضرت ابوذرؓ نے جب قبولِ اسلام کا اعلان حرم میں کیا تو چاروں طرف سے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ تو خیر ہوگئی کہ عین وقت پر حضرت عباسؓ آگئے اور انھوں نے کہا کہ یہ غفار کے قبیلہ کے آدمی ہیں اور تمہارا تجارتی راستہ ان کے قبیلہ کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے اگر انھوں نے تمہارا راستہ بند کرا دیا تو کیا کروگے؟ یہ سنکر لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ غرضکہ ابتلا و آزمائش کے دور میں جب قریش کے مظالم ختم ہونے کی صورت نہ رہی تو آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان نیک دل انصاف پسند عیسائی بادشاہِ حبشہ (نجاشی) کے پاس ہجرت کر کے چلے جائیں۔ تاکہ کچھ دنوں تو نجات ملے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ قریش نے وہاں تک بھی پیچھا کیا حالانکہ دال نہ گل سکی۔

جب شفیق بیوی حضرت خدیجہؓ اور حامی و محافظ چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو قریش کی مخالفت میں اور بھی شدت ہو گئی۔ چچا ابولہب تو شروع ہی سے مخالف تھی۔ اس لئے اب آنحضرتؐ کو نئے محافظ ڈھونڈنے پڑے۔ آپ کو خیال آیا کہ آپ کے ماموؤں کا خاندان طائف میں بستا ہے۔ آپ کے چھوٹے چچا حضرت عباسؓ طائف میں رقمی لین دین کرکے کافی رسوخ رکھتے تھے۔ چنانچہ بڑی امنگوں کے ساتھ آپؐ وہاں پہنچے۔ مگر چونکہ مکہ طائف کے مال کے لئے نکاسی کی منڈی تھا۔ اور ہر سال گرمیوں میں مکہ کے مالدار تاجر طائف آکر تبدیلیٔ موسم کے اوقات میں وہاں کی آمدنی بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ بنتے تھے۔ اس لئے طائف کے لئے مشکل تھا کہ مکہ کو ناراض کرے۔ لہذا دولت و اقتدار اور مکہ کے سے سیاسی و مذہبی وجوہ یہاں بھی توحید کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ اور آپ کو مجبوراً پتھر کھا کر مکہ ہی واپس ہونا پڑا۔ مایوسی کی حالت میں شہر کے باہر ہی بعض شناساؤں کی مدد سے تبلیغی دورے کرتے رہے خصوصاً حج کے زمانہ میں دعوت پہنچانا آسانی سے ممکن نہ تھا۔

منیٰ کے قریب (نقشہ نمبر ۱ دیکھیے) راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی ایک مسلسل دیوار ہے۔ مکہ سے تقریباً تین میل پر حدودِ منیٰ شروع ہونے سے ایک فرلانگ پہلے ہی بائیں ہاتھ پر ایک وسیع میدانی دائرہ بناتا ہوا پہاڑ پھر تنگ راستہ پر آ جاتا ہے یہ مقام عقبہ کہلاتا ہے۔ جہاں مشہور بیعت ہائے عقبہ ہوئی



تھیں۔ ایسی کھلی ہوئی مگر پہاڑوں سے محفوظ جگہیں اکثر پہاڑی سلسلوں میں بن جاتی ہیں (نقشہ نمبر ۲ دیکھئے) اسی سلسلہ میں ایسا ہی ایک محفوظ بڑا دائرہ عرفات کا میدان ہے۔ ایسی محفوظ جگہوں میں عام راستہ کی بھیڑ بھاڑ سے ہٹ کر تبلیغ کا کام اچھا ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج جن میں نسلوں سے خونریزیاں چلی آرہی تھیں اب اس قدر تھک گئے تھے کہ کسی قیمت پر بھی باہم دوستی پر آمادہ تھے اور اگر ان دونوں کے لئے کوئی غیر مدنی سردار مشترک مل جاتا تو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ صورتحال تھی کہ قبیلۂ خزرج کے (جس قبیلے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا رشتہ تھا) پانچ چھ آدمیوں سے عقبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی۔ اس جماعت نے اسلام کی دعوت سنی تو شوق سے ہر طرح امداد کا وعدہ کیا۔ جب مذکورہ چھ خزرجی مدینہ واپس گئے اور اسلام کا چرچا کیا تو سال بھر بعد حج کے موقع پر اوس اور خزرج دونوں کے دس بارہ آدمی آنحضرتؐ سے آکر اسی عقبہ میں ملے۔ انھوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اپنے اپنے خاندان کے بھی اسلام اور آپؐ کی اطاعت کا اظہار کیا۔ اس طرح آپ اوس اور خزرج کے بارہ خاندانوں کے مشترک سردار بن گئے (یہ بیعت عقبہ اولیٰ تھی) ایک تربیت یافتہ مبلغ مکہ سے ان کے ہمراہ مدینہ بھیجا گیا۔ دوسرے سال مدینہ کے کوئی پانچ سو حجاج میں سے ۷۲ مرد اور عورتیں آنحضرتؐ سے اظہار اسلام کرنے اور آپ کو مدینہ مدعو کرنے کے لئے آئیں۔ نو دس بجے رات یہ (۷۲) لوگ



سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں چھپتے چھپاتے اپنے پڑاؤ سے نکل کر (آج کل بھی حج کے موقع پر عرفات اور منیٰ کے میدانوں میں پڑاؤ ہوتا ہے) عقبہ میں جمع ہوتے گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ وہاں آ گئے۔ تفصیل کے ساتھ تحریک کے اغراض و مقاصد سُن کر انھوں نے آمنّا و صدّقنا کہا۔ اور آنحضرتؐ اور دیگر تمام مسلمانوں کو مدینہ چلنے کی رائے دی اور یقین دلایا کہ مدینہ آئیں تو ہم آپ کی ایسی ہی مدد اور حفاظت کریں گے جیسی کوئی اپنی اور اپنے بال بچوں کی کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے قبیلۂ خزرج سے نو اور قبیلۂ اوس سے تین اشخاص منتخب فرما کر انھیں نقیب (سردار) مقرر کیا۔ جب یہ لوگ بیعت کر رہے تھے تو سعد بن زرارہؓ نے کھڑے ہو کر کہا "بھائیو! یہ بھی جانتے ہو کہ تم کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ سمجھ لو یہ عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔" سب نے کہا کہ ہم یہ سب کچھ سمجھ کر بیعت کر رہے ہیں اور یقین دلایا کہ ہم اپنی بات سے کبھی نہیں پلٹیں گے۔ آنحضرتؐ نے سب سے ہاتھ ملایا (یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ تھی) اور کہا "میں بھی اب تمھارا ہوں۔ تمھاری جنگ میری جنگ ہوگی اور تمھاری صلح میری صلح"۔ ظاہر ہے کہ جب قریش کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت چیں بہ جبیں ہوئے اور اسے براہِ راست اپنے خلاف جتھابندی خیال کیا۔ چنانچہ ہجرت سے تین ماہ پہلے آنحضرتؐ نے اپنے ساتھیوں اور مکہ کے عام مسلمانوں کو مدینہ بھیج دیا۔ بعد ازاں جب قریش نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تو یہ کھُلّم کھُلّا اعلانِ جنگ کے مترادف نہ تھا؟

ہجرت کے بعد کی مشکلات:- مکہ میں جو مصیبت تنہا تھی مدینہ میں آ کر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مدینہ اب تک تو بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسولِ کریم حبیب اللہ کے دین کی خاطر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو آپؐ کی قیام گاہ ہونے نے اُس کو قریش کے غیظ و غضب کا آماجگاہ بنا دیا۔ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی اس لئے قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا۔ اس لئے مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیرِ اثر تھے۔ اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کے خلاف اس طرح بھڑکا دیا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمھاری آزادی تو آزادی ہستی تک فنا ہو جائے گی۔ دل میں انھیں اندیشہ اس بات کا تھا کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ

پہنچے گا دوسری طرف سارے عرب میں اُن کا قائم شدہ اثر جاتا رہے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدت تک مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تو ہتھیار باندھ کر سوتے؛ حاکم کی روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَصْحَابُہٗ الْمَدِیْنَۃَ وَاٰوَتْھُمُ الْاَنْصَارُ رَمَتْھُمُ الْعَرَبُ عَنْ قَوْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَکَانُوْا لَا یَبِیْتُوْنَ اِلَّا بِالسِّلَاحِ وَلَا یُصْبِحُوْنَ اِلَّا فِیْہِ" (آنحضرتؐ اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ اُن سے لڑنے کو آمادہ ہوگئے۔ وہ بہت تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔) قریش نے عبداللہ بن اُبَی (رئیس المنافقین) کو پیغام تک بھیجدیا تھا کہ محمد کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد دونوں کا فیصلہ کردیں گے؛ عبداللہ بن اُبَی (رئیس المنافقین) خود اندیشہ محسوس کر رہا تھا کہ تحریک کی کامیابی کا مطلب اپنے اثر و اقتدار کو کھودینا ہے۔ اس لئے اندر اندر وہ بھی مخالفت پر آمادہ تھا۔ مدینہ کے ارد گرد کے یہودیوں پر تو کسی طرح بھروسہ نہ کیا جاسکتا تھا۔ غرضیکہ جس طرح مدینہ کو بیرونی خطرات کا اندیشہ تھا ویسے ہی وہ اندرونی خطرات سے بھی گھرا ہوا تھا۔

ان حالات کی موجودگی پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں۔ مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام حفاظتِ خود اختیاری کی تدبیر تھی۔ نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام تو یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ دوم یہ کہ یمن سے شام کی تجارتی شاہراہ پر (دیکھئے نقشہ نمبر ۱) اپنی گرفت مضبوط کریں تاکہ قریش اور دوسرے وہ قبائل جن کا مفاد اس راستہ سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ enemical اور مزاحمتانہ belligerent پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں (جیسا کہ حج کے موقع پر ایک دفعہ ابوجہل کی دھمکی پر سعد بن معاذ انصاری نے کہا کہ اگر تم مسلمانوں کو حج سے روکتے ہو تو پھر ہم بھی اُن کی شامی تجارت کو روک دیں گے۔) اس مسئلہ پر آنحضرتؐ نے دو اہم تدابیر اختیار کیں (۱) مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان (دیکھئے نقشہ نمبر ب) اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے اُن کے ساتھ گفت و شنید

شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرفداری کے معاہدے کریں۔ سب سے پہلے بنو جہینہ سے جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقہ میں ایک اہم قبیلہ تھا معاہدۂ ناطرفداری طے ہوا۔ پھر ۲ھ کے آخر میں بنی ضمرہ سے جن کا علاقہ ینبع اور ذوالعشیرہ سے متصل تھا دفاعی معاونت کی قرارداد ہوئی۔ پھر ۲ھ کے وسط میں بنی مدلج بھی اس قرارداد میں شامل ہو گئے کیونکہ وہ بنی ضمرہ کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ (۲) قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لئے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کئے۔ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو خطرہ کا رخ بتانا تھا۔ لہٰذا ان تمام مہموں میں نہ تو کشت و خون ہوا۔ اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا۔ نہ ان میں حضور نے اہل مدینہ کا کوئی آدمی ہی بھیجا۔ تمام دستے خالص مہاجرین ہی سے مرتب فرماتے رہے تاکہ حتی الامکان کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں الجھنے سے جنگ نہ پھیل جائے (۳) یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے قبیلوں سے امن و



امان کا معاہدہ ہو جائے۔

اسلام کے زیر شرائط سے گذرنے کے لئے قریش نے زور دکھانا شروع کیا اور جنگ کشمکش کی صورت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں یا واقعات پیش آئے انھیں غزوات اور سرایا کے نام سے اکثر یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا مفہوم بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے تاکہ واقعات کی تفصیل سمجھتے وقت کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ غزوات (غزوہ کی جمع) کی اغراض متعین کردہ۔ دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔ یا (۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے، اور پیش قدمی کی گئی۔ سرایا (سریہ کی جمع) کی پانچ اغراض تھیں۔

(۱) **محکمہ تفتیش** — دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر رسانی کی غرض سے سب سے زیادہ ضروری تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے اس کے تنظیم پر توجہ کی۔ اس غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاسوس گئے۔ یہ دستے بھیجے جاتے تھے جو کبھی دس بارہ سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل نہ ہوتے تھے۔

(۲) **مدافعت** — دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کر کے فوجیں بھیجی جاتی تھیں۔ یہ مہمیں مدافعت ہی کی غرض سے ہوتی تھیں۔ مثلاً سرایا فدک، دومۃ الجندل، اور مریسیع وغیرہ۔

(۳) **قریش کی تجارت کی روک ٹوک** — کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسے تعمیر کیا تھا اور مسلمان دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔ قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرے سے روک دیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت (جو مدینہ کے اطراف سے ہوتا ہوا شام کو جایا کرتا تھا۔ دیکھئے نقشہ نمبر ب) روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دیں۔

آنحضرتؐ کی مہمات تو اسی غرض کے لئے تھیں۔ لیکن چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آجاتا تھا۔ اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مال تجارت بھی بطور غنیمت ہاتھ آتا تھا۔ قافلہ کو لوٹنا اصل مقصود نہ تھا۔ (یہی روک ٹوک تھی جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی)

(۴) امن و امان قائم کرنا — تمام قبیلے باہم لڑ رہے تھے یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے اور لڑتے۔ تجارت بالکل غیر محفوظ تھی۔ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی اور قتل و تاراج تھا۔ چونکہ اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا۔ اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں تصور کر سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سی مہمیں اسی غرض سے تھیں مثلاً مدینہ کی چراگاہ پر حملہ وغیرہ کے وقت۔

زیادہ تر جو قبیلے ڈکیتی اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے۔ ان کا انتظام اور ان کی گرفت سخت دشوار تھی۔ ان کی تعزیر کے لئے جب فوجیں جاتیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے۔ یا اور کسی طرف چل دیتے اور قابو میں نہیں آتے تھے۔ اس لئے ضرورتاً جو فوجیں بھی جاتیں غفلت کے اوقات میں بھی جاتیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔ ایسی ہی قوموں پر اچانک حملہ کیا جاتا تھا۔ خبر ملتے ہی اگر رسول کریمؐ فتنوں کو اٹھتے ہی نہ دبانے کی کوشش کرتے اور دشمنوں کو متحد ہونے سے پہلے منتشر کرتے تو پھر مدینہ میں ایک دن بھی ٹھہرنا محال ہو جاتا۔

اشاعتِ اسلام — چونکہ ملک میں امن و امان نہ تھا۔ نیز دشمنوں نے سارے عرب میں آگ لگا رکھی تھی۔ اس لئے جو سرایا دعوتِ اسلام کے لئے جاتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی بلکہ واقعۃً اکثر جماعت کی جماعت تبلیغی سلسلہ میں دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئی اور اگر کوئی بچ کر نکل آیا تو اسی نے خبر دی (مثلاً بئرِ معونہ اور رجیع کے واقعات)

اسی بنا پر اکثر تبلیغی سرایا کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی۔ لیکن افسروں کو تاکید کر دی جاتی تھی کہ صرف اشاعتِ اسلام مقصود ہے۔ لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں۔

البتہ فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت و جباری کا جاہلانہ تصور مٹانے کے لئے ان کے مراکز یعنی بت خانوں کو ڈھانے کے لئے بھی (جنھیں وہ اب تک اپنے ہاتھوں نہ ڈھانا چاہتے تھے) سرایا بھیجے گئے۔

الغرض یہ وہ ناگزیر جنگیں تھیں جن میں رسول کریمؐ اور مسلمان اضطراراً سات آٹھ سال تک شر سے بچنے کی خاطر شریک ہوتے رہے مگر ان میں کوئی جنگ ایسی نہیں کی جس کی ابتدا مسلمانوں نے کی ہو۔

جنگ افعالِ انسانی کا بدترین منظر ہے۔ خصوصاً زمانۂ جاہلیہ میں عرب کی جنگیں اپنی مثال نہ رکھتی تھیں۔ لیکن ہر قسم کے وحشیانہ افعال جو عمل میں آ رہے تھے ان کے مقابلہ میں اسلام نے عمدہ عمدہ اصلاحیں کیں اور ایک ایک کرکے ان کا استیصال کیا۔ یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جس کا خطبہ آپ نے عرفات میں دیا تھا۔ دیکھئے نقشہ نمبر ۱۔ ثار کے قانون کا ابطال بھی کر دیا۔ بالآخر یہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی۔ اسلام کی تعلیم نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ۔ قیامِ امن، رفعِ مفاسد۔ نصرتِ مظلوم اور تبلیغ و تہلیل کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

کامیابی کا راز :- آپ پیغمبر تھے۔ آپ کو تائیدِ خداوندی ضرور حاصل تھی۔ چنانچہ اکثر جنگوں میں نصرتِ الٰہی کی مختلف شکلوں میں نمودار بھی ہوئی (مثلاً کہیں پانی کا برس جانا جس سے فریقین پر مختلف اثرات طاری ہوئے۔ کہیں سرد ہوا کے تند جھونکوں کا اچانک پہنچ جانا جس سے دشمن کی فوج کو میدان چھوڑنا ہی پڑا) تاہم دورانِ جنگ آپ کے ایسے نمایاں کارنامے مشاہدے میں آتے ہیں جن سے بیشمار صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دراصل یہی وہ اخلاقی صفات تھیں جن کے سامنے مخالفوں کی تمام قوت چور چور ہو جاتی تھی ـــ مثلاً

● ـــ آپ کو اور آپ کے متبعین کو اللہ پر انتہائی توکل تھا۔ عین اُس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرِ پیکار ہوتیں رسولِ کریمؐ نہایت خضوع و خشوع اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے۔ بدر۔ اُحد۔ خندق اور خیبر جیسے بڑے بڑے معرکوں میں آپؐ کی یہی کیفیت تھی۔)

● ـــ سبیل اللہ کا واضح نقشہ ذہن نشین ہو جانے کے بعد اس راہ کے راہیوں میں لامحدود قوت کا پیدا ہو جانا لازمی تھا کیونکہ سوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی مادی مفاد پیشِ نظر نہ ہوتا تھا۔

● ـــ عزم و استقلال۔ قناعت و صبر۔ ہمت۔ دلیری و بلند حوصلگی۔ راست بازی و دیانتداری۔ قوتِ برداشت وغیرہ۔

● — ایثار و انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ اتنا تھا کہ تن من اور دھن کی بازی لگا دینے سے ذرا بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

● — دُشمن پر قابو پا جانے کے بعد کسی جنگ میں تبدیلیٔ مذہب پر نہ زور دیا نہ دباؤ ڈالا۔

● — بڑے سے بڑے قصور پر بھی معافی دی اور قیدیوں کو رہا کر دیا یا اُن کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔

● — ہمیشہ قلوب کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مفتوحوں کی ذہنیت کی کایا پلٹ کر دیتے اور ان کو مکمل طور پر اپنا لیتے ——————

جس طرح یہ ساری صفاتِ حسنہ کامیابی کے لئے اہم تھیں اسی طرح مختلف جنگوں میں آپ کی حربی تدابیر بھی نمایاں ہوئیں۔ جنگ بدر میں آپ کی تیاری بالکل نہ تھی۔ چنانچہ جنگ بدر کے بعد ہی اللہ کی طرف سے ہدایت آئی ہیں کہ آیندہ سے پوری تیاری رہنی چاہیئے :- "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ" (انفال) اور ان کے مقابلہ کے لئے جس قدر تمہارے امکان میں ہو قوت اور رباط الخیل مہیا رکھو۔ اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے سوا ان دوسرے لوگوں کو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انھیں جانتا ہے مرعوب (خوفزدہ) کر دوگے۔ اس کام میں جو کچھ تم فی سبیل اللہ خرچ کر دگے وہ تمھیں پورا کا پورا واپس مل جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اس آیت کا نزول ہی ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں کو جنگی ضروریات کے لئے اخلاقی قوتوں کے علاوہ مستقل فوج بھی رکھنی چاہیئے جو ہمیشہ تیار ہو ... تیار رہے۔ سپاہیانہ فنون کا سیکھنا اگر ایک مذہبی فریضہ نہ ہوتا تو رسول کریم نے مسلمانوں پر شروع ہی سے یہ واضح نہ کر دیا ہوتا کہ "اللہ تعالیٰ ایک تیر کے بدلے میں تین اشخاص کو بہشت میں داخل کرتا ہے۔ ایک تیر بنانے والے۔ دوسرے اُسے خدا کی راہ میں لے جانے والے اور تیسرے اسے فی سبیل اللہ چلانے والے کو۔ اسی طرح آپ نے جائز کھیلوں میں تیراندازی اور گھوڑے کی تادیب کو شمار کیا۔ مدینہ میں جب مسجد عمامہ کے میدان سے گھوڑ دوڑ شروع ہوتی تو نبی کریم خود ہی شامی

دروازے کے پار مسجد السبق پر نتائج جانچنے کھڑے ہوتے تھے)۔ مختلف عہد میں آلاتِ حرب تبدیل ہوتے گئے اس زمانہ کے حربی آلات میں تیر اندازی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سامانِ جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ "قوت" سے بیان کیا ہے۔ جو ہر زمانہ میں بہترین حربی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ امام فخرالدین رازیؒ نے "قوۃ" کے مفہوم میں وہ تمام چیزیں شامل کی ہیں جو قوت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ مثلاً تمام آلات حرب خواہ وہ دفاعی صورتوں میں مستعمل ہوں یا حملوں کے اوقات میں استعمال کئے جائیں۔ "مَا اسْتَطَعْتُمْ" کے لفظ نے "قوۃ" کو مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف کر دیا یہاں تک کہ انھیں ہر اُس وسیلۂ جنگ کو اختیار کرنا چاہیئے جو دشمنانِ حق سے مقابلہ کرنے میں کام آسکے۔ اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو۔ یہ نہیں ہے کہ اُن سے یہ فرض ساقط ہو جائے۔ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط رکھتی ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اس کی علانیہ دشمن ہوں وہ اس سے مرعوب و خوفزدہ رہتی ہیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اُس کے ساتھ دشمنی کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا۔ اور اس حفظ ماتقدم کی تیاری میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے یہ نہ سمجھو کہ ہمیشہ کے لئے وہ تم سے ضائع ہو گیا۔ بلکہ درحقیقت وہ تمھیں اس صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم سے محفوظ رہنے کی حالت میں تمھیں پُرامن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

جنگوں کی تفصیلات سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ رسولِ کریمؐ نے ہر امکانی قوت سے کام لیا یا نہیں؟ اور اگر کہیں (مثلاً احد و حنین کے موقعوں پر) آپ کے سپاہیوں سے ذرا بھی لغزش اور کوتاہی ہوئی وہاں نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اور رسولِ کریمؐ کے بعد اس فریضہ پر حضرت عمرؓ نے بہت زیادہ عملی قدم بڑھا کر فوجی صیغہ کو ایک دم منظم کر دیا۔ یہاں تک کہ بری و بحری سرحدوں پر بھی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ چنانچہ نتائج سے بھی فیضیاب ہوئے۔ اسی طرح اگر موسیٰ بن نصیر نے تونس میں جنگی جہاز سازی کا کارخانہ نہ قائم کیا ہوتا تو سمندر کی بساط پار کر کے سلی۔ اسپین اور فرانس تک کیسے روشنی پھیلتی؟

رسولِ کریمؐ کی جنگوں کے مطالعے سے پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب اس بات کا نہایت احتیاط کے ساتھ پتہ چلایا جائے کہ آپؐ نے جنگ کے اصولوں کو کس طرح برتا اور اُن سے کیا نتائج برآمد

کر سکے۔ کیونکہ "انسان کی فطرت اور وہ قواعد جن پر جنگ مبنی ہوتی ہے بدلتے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ نہایت قدیم زمانہ کی معرکہ آرائیوں سے بھی قیمتی سبق سیکھے جا سکتے ہیں۔" (وار آفس کے تربیتی قوانین ۱۹۳۴ء)

"Human nature and the underlying principles of war do not change, and it is for this reason that valuable lessons can be learned from even the most ancient compaigns" —— War Office Training Regulations 1934

اقدامات اور آلاتِ جنگ پر سرسری نظر: اصولِ جنگ کے موافق اکثر غزوات میں رسول کریمؐ اپنا ارادہ پہلے سے نہ بتاتے تھے کہ کہاں کا حملہ ہے۔ (ابن اسحاق کا بیان ہے کہ صرف تبوک کے معرکہ کو تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔)

فوجی مہموں میں غیر سمت چل کر نامانوس راستوں سے گزرتے ہوئے دشمن کو اچانک جا لینا۔

فوج کی تعداد کی کمی، اور اس کی بنا پر کمزوری کا علاج مختلف تدابیر سے کرنا۔ مثلاً کیمپوں میں رات کے وقت زیادہ تعداد میں چولھوں کو روشن کرنا۔ خندق کھدوا کر قلعہ بند ہو جانا۔ میدان جنگ میں کلیدی مقامات پر مورچہ بندی۔ اور دشمن کی تیاری سے پہلے پہلے اس کا پیچھا کرنا بلکہ سرحد تک پہنچ کر مرعوب کر دینا۔

محکمۂ تفتیش کے ذریعہ دشمن کا پتہ چلا کر اچانک حملہ کر دینا۔ مگر کبھی رات کو حملہ نہ کر کے اپنی امتیازی سنت قائم کر دی۔

اکثر حالات میں قدرت کی عطا کردہ جغرافیائی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھانا۔

اپنی اور صحابہؓ کی ثابت قدمی اور استقلال سے عام فوج کی ہراس کو دور کر کے ان کی ہمت افزائی کرنا۔

اونٹوں کی کمی پر کئی کئی کا سوار ہونا یا باری باری سے سوار ہونا۔ رسد کی کمی پر فاقہ کشی بھی اختیار کرنا۔

تیر کمان۔ ڈھال تلوار۔ خود زرہ۔ برچھی بھالا کے علاوہ قلعہ شکن آلات (مثلاً منجنیق، ضبور، دبابہ

۔ آواز وغیرہ) سے بھی کام لینا۔ جنگوں میں اکثر اپنا شعار (WATH-WORD) مقرر کرنا تاکہ دوست دشمن کی شناخت ہو سکے۔

ضرورت کے مطابق کہیں انگلیوں کے پوروں پر کہیں گردن کے اوپر مارنے کہیں گھوڑوں کے حملوں کو روکنے کے لئے بڑے پھل کی تیروں کے چلانے کا حکم دینا۔

بہادر۔ تجربہ کار اور قابل سپاہیوں اور صحابیوں (مثلاً حمزہؓ۔ سلمان فارسیؓ۔ حباب بن منذرؓ اور خالد بن ولیدؓ وغیرہ) کی موجودگی اور اُن کے مفید اور پختہ مشوروں سے فائدہ اٹھانا۔

یہ اور ان ہی جیسے دیگر اقدامات تھے جو ذیل کے مواقع پر رسولِ کریمؐ نے اختیار کئے تھے۔

جنگوں کی تاریخی ترتیب:- (۱) آپ کی ہجرت (بطور تمہید و دیباچہ) ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء

(۲) جنگ بدر ———— ۱۷ رمضان سنہ ۲ھ

(۳) بنو قینقاع کے ساتھ جنگ ———— شوال سنہ ۲ھ

(۴) غزوۂ سویق ———— ذی الحجہ سنہ ۲ھ

(۵) جنگِ اُحد ———— سنیچر ۱۱ شوال سنہ ۳ھ

(۶) سریۂ حمراء الاسد ———— اتوار ۱۲ شوال سنہ ۳ھ

(۷) بدر صغریٰ ———— سنہ ۴ھ

(۸) بنو نضیر کے ساتھ جنگ ———— ربیع الاوّل سنہ ۴ھ

(۹) غزوۂ مریسیع یا بنی مصطلق ———— ۲ شعبان سنہ ۵ھ

(۱۰) جنگِ خندق یا غزوۂ احزاب ———— ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۵ھ

(۱۱) بنو قریظہ کے ساتھ جنگ ———— ذی الحجہ سنہ ۵ھ

(۱۲) غزوۂ ذی قرد ———— ذی الحجہ سنہ ۶ھ یا محرم سنہ ۷ھ

(۱۳) جنگِ خیبر ———— ذی الحجہ سنہ ۶ھ یا محرم سنہ ۷ھ

(۱۴) غزوۂ وادی القریٰ اور فدک ———— محرم سنہ ۷ھ

(۱۵) جنگِ موتہ ———————— جمادی الاول ۸ھ

(۱۶) فتح مکہ ———————— ۸ رمضان ۸ھ

(۱۷) جنگِ حنین ———————— شوال ۸ھ

(۱۸) محاصرۂ طائف ———————— شوال و ذیقعدہ ۸ھ

(۱۹) غزوۂ تبوک ———————— رجب ۹ھ

ان ہی جنگوں کا تذکرہ درج کیا جا رہا ہے جن میں سے صرف خصوصی جنگوں کی تفصیل پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(۱) آپ کی ہجرت (بطور دیباچۂ جنگ): ۔ ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول کریمؐ حضرت ابوبکرؓ کے گھر مشورہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اور ان سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی۔ آنحضرتؐ کے قتل کی تدبیر ابوجہل نے اس طرح کی تھی کہ عرب کے ہر مشہور قبیلہ سے ایک جوانمرد منتخب کیا جائے اور یہ سب مل کر رات کی تاریکی میں محمدؐ کے گھر کو گھیر لیں۔ اور صبح نماز کے لئے جاتے وقت یہ سب ان پر فوراً سے حملہ کریں۔ اس طریق سے قتل میں تمام قبیلے شامل ہوں گے اور ان کا بدلہ نہ محمدؐ کا قبیلہ لے سکے گا۔ نہ ان کو بچانے والے کچھ تر فساد اٹھا سکیں گے۔

جب یہ تہیہ ہو چکا تو اسی رات آنحضرتؐ کی ہدایت سے حضرت علیؓ آپکے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہے تاکہ دوسری صبح سب کی امانتیں جا کر واپس دیدیں اور خدا کا رسولؐ خدا کی حفاظت میں سورۂ یٰس پڑھتا ہوا باہر نکل گیا (۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) کسی نے جاتے نہ دیکھا۔ دشمن کے تعاقب کے خیال سے مدینہ کی مانوس راہ چھوڑ کر جو شمال کی جانب تھی۔ (دیکھئے نقشہ نمبر ۱) جنوب کی راہ اختیار کی (جہاں کہ آپ کا مکان مکہ کے شمالی محلہ میں تھا)۔

پہلے رسول کریمؐ حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے جلدی سے سفر کا ضروری سامان درست کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نے دو تین دن کا کھانا رکھ کر ناشتہ دان کا منہ کمر کی پیٹی (نطاق) پھاڑ کر اسی سے باندھا۔ اور اسی شب کی تاریکی میں دونوں چل پڑے۔ مکہ کی نشیبی جانب محلہ مسفلہ سے جنوب کی طرف

(دیکھئے نقشہ نمبر ۱) دو تین میل کے فاصلہ پر جبلِ ثور ہے جس کی بلندی تقریباً ایک میل ہے (جس طرح بدر کے جبلِ اسفل سے بحرِ احمر دکھائی دیتا ہے ویسے ہی اس کی چوٹی پر سے دکھائی دیتا ہے) جس کی چڑھائی سخت تھی اور راستہ بالکل سنگین اور نکیلے پتھروں سے ناہموار تھا۔ جن کی ٹھوکروں سے رسولِ کریمؐ کے پائے نازک زخمی ہو رہے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح ان دونوں نے یہ مسافت طے کی اور آخرکار ایک غار تک پہنچ گئے جس کی تقدیر وا گئی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے غار کو صاف کیا اور تن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر اس کے روزن بند کئے۔ پھر رسولِ کریمؐ بھی اندر تشریف لے گئے۔ اس غار میں دونوں تین روز تک رہے۔ رات کی تاریکی میں حضرت اسماءؓ روٹی دے جاتیں عامر بن فہیرہؓ (ابو بکرؓ کا غلام جس کے پاس ان کا ریوڑ تھا) کچھ رات گئے بکریاں لاتا۔ بقدرِ ضرورت یہ لوگ دودھ لے لیتے۔ اور وہ پھر ریوڑ سے آنے والوں کے نقشِ قدم کو تمام راستے مٹا دیتا۔ حضرت ابو بکرؓ کا بیٹا عبد اللہؓ شب کو غار میں ساتھ جاتا اور صبح اندھیرے منہ شہر چلا جاتا اور پتہ لگاتا کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں شام کو سناتا۔

اُدھر قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے پر سخت جھنجلائے۔ غصہ اور ندامت سے حضرت علیؓ کو مار پیٹ کر آخرکار چھوڑ دیا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کے گھر جا کر اسماءؓ سے پوچھا "تیرا باپ کدھر ہے؟" وہ بولیں "مجھے معلوم نہیں"۔ ابو جہل نے ایسا طمانچہ مارا کہ ان کے کان کی بالی نیچے گر گئی۔ اور کچھ نہ سوجھا تو باقی غریب مسلمانوں کو اور زیادہ ستانے لگے۔ اور آپ کی اور دیگر مہاجرین کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ آنحضرتؐ کا ضبط شدہ مکان وہ تھا جو آپ کو بی بی خدیجہؓ سے وراثت میں ملا تھا۔ خون کے پیاسے دشمن آپ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اطرافِ مکہ کی وادیوں کا کوئی گوشہ انھوں نے ایسا نہ چھوڑا جہاں آپ کو تلاش نہ کیا ہو۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ ان میں سے چند لوگ عین اسی غار (غارِ ثور کی پوزیشن نقشہ نمبر ۱ میں دیکھئے) کے دہانے پر بھی پہنچ گئے۔ ان لوگوں کے قدموں کی آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ کچھ پریشان ہوئے لیکن آنحضرتؐ نے نہایت اطمینان کے ساتھ انھیں تسلی دی "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" (التوبہ) (گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے غار کے منہ پر کچھ علامتیں (مکڑی کا جالا اور کبوتر کا گھونسلا وغیرہ) پیدا ہو گئی تھیں کہ کافروں کو گمان بھی نہ ہو سکا کہ اس غار میں کوئی داخل ہوا ہوگا۔

چنانچہ یہ لوگ واپس چلے گئے۔

تب چوتھے دن (۱۶ ستمبر ۶۲۲ء) یہ لوگ غار سے نکلے۔ حضرت ابوبکرؓ نے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر فربہ اور تیار کر رکھی تھیں۔ اُن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتاً پسند فرمائی۔ اُس پر آپ اور حضرت ابوبکرؓ سوار ہوئے۔ دوسری پر عامر بن فہیرہ کے ساتھ عبداللہ بن اُریقط (ایک کافر جس پر اعتماد کیا۔ جسے رہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کر لیا تھا) سوار ہوا۔ دشمن کا ڈر تھا اس لئے ان لوگوں نے مکے سے مدینہ کو براہِ راست (مدینہ کو جنوبی سمت سے) داخل ہونے والا راستہ اختیار کیا تھا جو صرف وادیوں اور گھاٹیوں سے گذرتا ہے۔ یہ راستہ لاوے کے سیاہ پتھروں سے اٹا ہوا ہے۔ اس لئے دشوار گذار بھی ہے اور قدیم زمانہ میں شاذ و نادر ہی اختیار کیا جاتا تھا اور کاروانی راستہ ذوالحلیفہ سے وادی العقیق ہوتا ہوا شمال کی جانب وادی قناۃ کے سنگم تک جا کر مدینہ جانے کے لئے پھر جنوب کی طرف مڑتا تھا۔ اور نرم ریت پر مشتمل ہونے کے باعث اونٹوں کو بھی پسند تھا۔ اُن کا اختیار کردہ راستہ غیر مانوس تھا اس لئے ایک راہبر رکھنا پڑا جو آگے آگے راستہ بتاتا چلتا تھا۔

ادھر قریش نے مشتہر کر دیا تھا کہ جو شخص محمدؐ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی ۱۰۰ اونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم انعام کی امید میں نکلا تھا جب راہبر نے کچھ دور جا کر سمندر کے کنارے والے راستے کو اختیار کیا اور یہ لوگ رابغ کے موجودہ قلعہ اور ساحلِ بحر کے درمیانی میدان سے گذر رہے تھے (دیکھئے نقشہ نمبر ب) تب سراقہ نے اُن لوگوں کا تعاقب کیا۔ مگر پہلے تو اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی پھر دوبارہ کوشش کی تو اللہ کے حکم سے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔

حسنِ اتفاق سے حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لیکر آ رہے تھے۔ انھوں نے آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند کپڑے پیش کئے جو اُس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں۔ اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج اُن کا نشان نہیں ملتا ـــــ خرار۔ ثنیۃ المرۃ۔ لقف۔ مدلجہ۔ مرجح۔ حداثہ۔ اذاخر۔ رابغ وغیرہ مقام

آج بھی حجاج کے راستہ میں آتا ہے۔ یہاں آپ نے مغرب کی نماز پڑھی تھی، اثلم[۹]۔ غانیہ[۱۰]۔ فاجہ[۱۱]۔ عرج[۱۲]۔ جدوات[۱۳]۔ رکوبہ[۱۴]۔ عقیق[۱۵]۔ جنجانہ[۱۶]۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ مدینہ سے جنوب کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اُسے عالیہ یا قُبا کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے۔ سب سے ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا جس کے سردار کلثوم بن الہدم تھے۔ ان ہی کی مہمانی رسول کریمؐ نے قبول کی (جمعرات ۸ ربیع الاول سنہ ۱ھ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) یہاں پہلے سے اکثر صحابہؓ پہنچ چکے تھے۔ اور حضرت علیؓ بھی۔ یہیں پر پہلی مسجد (مسجد قُبا) کی بنیاد ڈالی۔ چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) آپ شہر میں داخل ہوئے تو اُسی روز سے یثرب (مدینہ کا قدیم نام) کا نام مدینۃ النبیؐ (مختصراً مدینہ) ہو گیا۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ جمعہ کی نماز سو آدمیوں کے ساتھ پڑھی اور خطبہ سنایا۔ یہی سب سے پہلی نماز جمعہ تھی۔ جب شہر قریب آگیا تو جہاں پر اب مسجد نبویؐ ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں مہمان ہوئے اور سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اور جب مسجد نبویؐ تیار ہو گئی تو منتقل ہو گئے۔

شہر میں داخلہ کے وقت تمام جان نثاران بے چین و بے قرار تھے۔ انصار کی معصوم لڑکیاں مکانوں کی چھتوں پر اشعار گا رہی تھیں :-

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

کامل چاند ہم پر نکل آیا وداع کی گھاٹیوں سے

ثَنِيَّات جمع ہے ثَنِيَّة کی۔ ثَنِيَّة کہتے ہیں ٹیلہ کو۔ سفر ہجرت میں نبی کریمؐ نے ثَنِيَّةُ البول، ثَنِيَّةُ الجائر، ثَنِيَّة مردان اور ثَنِيَّة العَير سے عبور فرمایا تھا۔ اور ثَنِيَّةُ الوداع کا ٹیلہ بھی قُبا کے جنوب میں ہے یہ سب ٹیلے مدینہ کے قرب میں ہیں۔ اور اہلِ مدینہ دوستوں کو یہاں تک چھوڑنے (الوداع کہنے) آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس نام سے یہ مشہور ہوا۔ اور یہ سارے ٹیلے ثُنیات الوداع کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) جنگِ بدر :- اسباب :- ہجرت کے بعد ہی سے قریش مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے (جیسا کہ عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس خط بھیجکر آگاہ کر چکے تھے) مگر ان کے درمیان بنی کنانہ کا علاقہ پڑتا تھا جن سے قریش

کی جانی عداوت کئی پشت سے چلی آتی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ بنی کنانہ ان کو اپنے علاقہ سے فوج نہ لے جانے دیں گے (دیکھئے نقشہ نمبر ب) اور اگر فوج کو راہ مل بھی گئی تب بھی اندیشہ تھا کہ بنی کنانہ فوج کا سلسلہ عقب سے منقطع کردیں اور اُدھر خود مکہ پر حملہ کرکے اس پر قابض ہوجائیں۔ کیونکہ وہاں بھی میدان صاف رہے گا۔ سُراقہ (جس نے نبی کا تعاقب سفرِ ہجرت میں کیا تھا) اس درمیانی علاقہ کا کنانی سردار تھا۔ یہ بات اُسے معلوم ہوئی تو خود مکہ گیا۔ تمام پچھلی عداوتوں کو چھوڑ کر قریش کے ساتھ معاہدۂ اتحاد کرلیا۔ یہی تھا وہ معاہدۂ شیطانی جس کے ذریعہ مسلمانوں پر قریش کے حملہ کرسکنے کا یہ شخص سببِ قوی بنا۔

رجب ۲ھ میں آنحضرتؐ نے عبداللہ بن جحشؓ کو ۱۲ آدمیوں کے ساتھ مقام نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان مدینہ سے ایسا ہی نظر آتا ہے۔ دیکھئے نقشہ نمبر ب) میں قیام کرکے قریش کے منصوبوں کا پتہ لگانے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اپنی طرف سے قریش کے چند آدمیوں پر جو شام سے تجارتی مال لیکر آرہے تھے عبداللہؓ نے حملہ کردیا اور ان میں سے ایک شخص عَمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو گرفتار ہوئے اور مالِ غنیمہ ہاتھ آیا۔ مگر اس واقعہ کو سُنکر آنحضرتؐ عبداللہؓ پر نہایت ہی برہم ہوئے ـــ نخلہ مکہ سے قریب ہی تھا۔ چنانچہ اس واقعہ نے بہت جلد تمام قریش کو مشتعل کردیا اور سارا مکہ جوشِ انتقام سے لبریز ہوگیا۔ غزوۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے ـــ۔

خود حریفانِ جنگ کی شہادت اس سبب کی تائید کرتی ہے ـــ حضرت حکیمؓ بن حزام حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے (غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت کافر تھے۔ فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے۔ وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔ اُن سے بدر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عُتبہ (جنگِ بدر میں قریش کا سپہ سالار) کے پاس گیا اور میں نے اُس سے کہا "یَا اَبَا الْوَلِیْدِ هَلْ لَكَ اَن تذهب بشرف اليوم ما بقيت قال افعل ماذا؟ قُلتُ انكم لا تطلبونَ مِن مُحَمَّدٍ اِلَّا دَمَ ابن الحضرمی وَهُوَ حليفكَ فتحمل ديته فترجع بالنّاس" (اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عُتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا تم (یعنی قریش) محمد سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ

نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا۔ اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔ عتبہ نے یہ تجویز پسند کی لیکن ابوجہل نہ مانا۔ اور عمرو حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا کہ خون کا بدلہ سامنے کھڑا ہے۔ کھڑے ہو کر قوم سے دہائی کرو۔ دہائی کے بعد آغازِ جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدانِ جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔ حکیم بن حزام۔ عامر حضرمی اور عتبہ و ابوجہل اگر غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے تو پھر ان کے مقابلہ میں اوروں کا جو سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے، یہ سمجھنا کہ بدر کی لڑائی کا سبب دوسرا تھا (قافلۂ تجارت کا حملہ سے بچانا) کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

اسی موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت ابوسفیان کی سرداری میں شام کو بھیجا گیا تھا اس پر مکہ کی پوری آبادی نے اپنی اپنی پونجی لگا دی تھی اور تجارت کے منافع ہی پر جنگ کا سارا دارومدار تھا۔ اس لئے قافلہ کی واپسی کا قریش بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ابھی شام سے واپسی کے لئے یہ قافلہ روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ رجب سنہ ۲ھ میں) حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ شام کو جاتے وقت جب اس قافلہ کا گذر مدینہ کے اطراف سے ہوا تو کوئی حملہ نہ ہوا تھا۔ مگر جب واپسی کا ارادہ کیا تو ابوسفیان نے دیکھا کہ ساتھ میں پچاس ہزار اشرفی کا مال ہے اور محافظ صرف تیس چالیس۔ اس لئے سابق اندیشوں کی بنا پر اس نے اپنی قیاس آرائی پر شعبان سنہ ۲ھ میں ضمضم نامی سوار کو مکہ دوڑایا کہ یہ خبر دیدو کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے مدد کرو۔ اُدھر قریش تو پہلے سے بھرے بیٹھے تھے۔ جب یہ افواہ پہنچی تو اس نے بارود میں چنگاری کا کام کیا۔ بس شعلہ بھڑک اٹھا۔ جو مطلب تجارتی مال و زر سے قافلہ پہنچنے پر نکلتا وہ اس عجیب بہانہ سے نکل آیا۔ قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے مدافعت کا قصد کیا۔ آپ کے جاسوسوں نے اس بات کی بھی خبر دی ہوگی کہ شام سے ابوسفیان بھی تجارتی قافلہ لیکر واپس آ رہا ہے حضرمی کا قتل خود ہی پہلے سے آپ کے لئے پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا۔

سورۂ انفال کے نص سے پتہ چلتا ہے کہ اگر قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو خوف و اضطراب

اور بیدلی تھی کس بنا پر تھی؟ اس سے پہلے بارہا قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اِس دفعہ اسی قافلہ کا آنا ہے کہ تین سو جید اور منتخب فوج سے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں؟ "وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ ۝ یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝"

(الانفال) (اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے حالانکہ وہ صاف صاف ظاہر ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور یاد کرو وہ موقع جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مقابلہ میں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں مقابلہ میں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے چاہے یہ بات مجرموں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو)۔ پھر اسی سورہ میں کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت یہ ہے "وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" (اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائشی اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے) — اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کو بچانے کے لئے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا اس لئے خدا نے اس کو غرور و نمائش اور صدّ عن سبیل اللہ کہا۔

— ابوسفیان کا قافلہ بھی چلا آ رہا ہے۔ اسی لئے لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمسا رہے تھے۔ ان کو یہی نقشہ نظر آ رہا تھا کہ اتنی کم تعداد اور بے سروسامانی کے ساتھ گویا وہ موت کے منہ میں بھیجے جا رہے ہیں۔

واقعات ۔ رسول اللہ نے بھی عزم فرمایا کہ جو قوت بھی اس وقت میسر ہے اُسے لیکر نکل پڑیں۔ آپ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے تھے ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا تھا۔ اس موقع پر مشورہ کے لئے آپ نے مہاجرین کے ساتھ انصار کو بھی جمع کیا۔ اور اُن کے سامنے پوزیشن صاف صاف رکھدی کہ شمال کی طرف سے تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے قریش کا لشکر (دیکھئے نقشہ نمبر ب اور ج)۔ تقریروں کے بعد یہ فیصلہ ہوگیا کہ مقابلہ پر چلنا ہے۔ چونکہ شام سے مکہ کو جانے کا کاروانی راستہ بدر کی گھاٹی سے ہوکر گذرتا ہے اور مدینہ کا راستہ بھی اسی جنکشن کے قریب ملتا ہے (دیکھئے نقشہ ب) اس نے جنوب مغرب کی سمت بدر کی طرف مدینہ کے انتظامات کے بعد ۱۲ رمضان ۲ھ کو آنحضرت اپنے جاں نثاروں کے ساتھ نکل پڑے۔

فوج کی تعداد کل ۳۱۳ تھی جن میں ۶۰ مہاجرین باقی انصار تھے۔ گھوڑے صرف دو تین تھے۔ سامانِ جنگ بالکل ناکافی تھا یہاں تک کہ صرف چھ زرہیں تھیں۔ مدینہ سے بدر کا فاصلہ ۸۰ میل کے قریب تھا اور سواری کے لئے اونٹوں کی تعداد صرف ،، تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک اونٹ تین چار اشخاص کے لئے وقف تھا جو باری باری سے سوار ہو سکتے تھے۔ دو خبر رساں (ساندنی سوار) آگے روانہ کر دیئے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ عہد نبوی اور اس سے پہلے تک۔ مدینہ اور بدر کے راستوں کے منازل جداگانہ تھے (موجودہ نقشوں میں یہ مقامات مشکل سے ملیں گے ۔ انصرف۔ ذات۔ اجزال۔ معلاۃ۔ اور اثیل (مدینہ سے بدر کی راہ کے منازل) سے گذرتے ہوئے ۱۶ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے تو خبر رسانوں نے خبر دی کہ ابوسفیان کا قافلہ اب جنکشن پر آنے ہی والا ہے۔ اور لشکر قریش جنوبی وادی کے سرے پر پہنچ آئے ہیں۔ لہٰذا آنحضرتؐ راستہ کے شامی داخلہ کے پاس ہی پڑاؤ ڈالتے ہیں (دیکھئے نقشہ نمبر ج) تاکہ قافلہ قریش کے لشکر سے نہ ملنے پائے۔ میدانِ بدر میں داخلے تین سمت تھے اور یہی تین وادیاں تھیں۔ ایک مدینہ کی طرف سے داخلہ جس سے آنحضرتؐ داخل ہوئے۔ رہ گئیں دو وادیاں ایک شامی داخلہ کی وادی تھی اور دوسری مکہ کی جانب سے داخلہ والی وادی۔ اور ان دونوں وادیوں کا فاصلہ تقریباً ایک ہی میل کی دوری پر تھا جس کی طرف رسولِ کریمؐ اپنے جاں نثاروں کو

یکر ٹھہر گئے۔ جب کہ مکہ والا داخلہ تقریباً چار میل دور تھا۔

اُدھر شام سے آنے والے قافلہ کو بدر کے جنکشن پر پہنچنے سے پیشتر ہی روک کر ابوسفیان ٹوہ لینے نکل ہے۔ اور آنحضرتؐ کے سانڈنی سوار کے اونٹ کے نقشِ قدم پر چل کر تازہ مینگنیاں دیکھیں اور فوراً چوکنا ہو کر قافلے کے پاس بھاگا۔ اور عام تجارتی شاہراہ کو چھوڑ کر بدر کی گھاٹی کے مغربی ڈھلان پہلو (جبل اسفل سے مغرب) کی طرف مڑ جاتا ہے (جو بدر اور بحرِ احمر کے درمیان ہے) اور ساحل کے قریب سے جلدی جلدی بغیر آرام کئے قافلہ کو مسلمانوں کی دسترس سے بچا کر صحیح سلامت مکہ پہنچ جاتا ہے مگر اس کے پہنچنے سے قبل ہی لشکرِ قریش بھی مکہ سے نکل چکا تھا۔ ان تینوں حرکت کرنے والوں کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے "إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ" (انفال) (جب کہ تم مسلمان قریب والی وادی کے پاس تھے اور وہ لوگ یعنی قریش دور والی وادی کے پاس تھے اور تیسرا فریق یعنی ابوسفیان کا قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا)۔
(نقشہ نمبر ۲ دیکھئے)

اس طرح گویا مقابلہ ہوگا رسولِ کریمؐ کی مختصر فوج اور قریشِ مکہ کے عظیم الشان لشکر کے درمیان۔ حالانکہ رسولِ کریمؐ مدینہ والے داخلہ کے پاس ابوسفیان کے قافلہ سے پہلے پہنچ چکے تھے مگر وہ کترا کر نکل گیا۔ نہ رسولِ کریمؐ سے اس کا مقابلہ ہو سکا اور نہ وہ لشکرِ قریش کے ساتھ مل سکا۔ یہ ساری باتیں ایسی اپنے اپنے وقت سے ہوئیں کہ اگر تینوں پارٹیاں مدینہ، شام اور مکہ سے آپس میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بھی نکلتیں تو شاید ہی ایسے ٹھیک ٹھیک وقت پر پہنچ سکتیں۔ قرآن کریم میں اسی واقعہ پر اللہ کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ" (انفال) (اور اگر کہیں پہلے سے تمہارے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو ضرور وقت کی پابندی میں کسی نہ کسی فریق سے دیر سویر ہو جاتی۔ لیکن تم کو خدا نے اچانک ایک دوسرے سے بھڑا دیا تاکہ خدا کو جو

کچھ کرنا منظور تھا اسے پورا کر دکھائے تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے)

مکہ سے قریش بڑے ساز و سامان سے نکلے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ کی سپہ سالاری میں تقریباً ایک ہزار کی جمعیت تھی جن میں بڑے بڑے سرداران قریش سب شریک تھے۔ ابو لہب نہ آسکا تھا مگر اس نے اپنا قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا معقول انتظام تھا۔ سو سواروں کا رسالہ تھا اور کئی سو اونٹ تھے جنگی سپاہیوں میں سے چھ سو زرہ پوش تھے۔ اس موقع پر قریش مکہ کو مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ نے بھی اسلحۂ جنگ سے مدد دی تھی۔ لشکر قریش کے اسلحہ میں تیر و کمان۔ تلوار ڈھال۔ برچھیاں و بھالے۔ گرز و خنجر۔ زرہ و سپر۔ سروں کا خود۔ چہروں کا جھلم اور ہاتھوں کا دستانہ تھا۔ اعلان جنگ کے لئے نقارہ و طبل بھی تھا۔ اس ڈیڑھ دو ماہ کی ساری تیاری (اَلَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ـ انفال) کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف قافلہ کو بچا لائیں۔ بلکہ حضرمی کے خون کا بدلہ بھی مل جائے اور آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ مدینہ میں یہ مخالفت جو نئی نئی مجتمع ہونی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں۔ اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آئندہ کے لئے تجارتی شاہراہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

جانا بدر کے قریب پہنچکر قریش کو معلوم بھی ہو گیا (ابوسفیان نے مکہ پہنچکر اطلاع بھیجی) کہ تجارتی قافلہ مع اپنے قیمتی سامان کے صحیح سلامت مسلمانوں کی زد سے نکل کر مکہ پہنچ گیا ہے۔ تب بھی ابوجہل جیسے سرداروں نے یہی فیصلہ کیا کہ چڑھائی ہو چکی ہے اب پلٹ جانا ناممکن ہے۔ اور میدانِ جنگ کی طرف بڑھے (دیکھئے نقشہ نمبر ۲)۔ آنحضرتؐ کے ہمراہی تجربہ کاروں نے بھی جو بدر کے جغرافیہ سے واقف تھے مشورہ دیا کہ جنوب سے آنیوالے دشمن کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ کی جگہ کو بدلنا ہوگا۔

میدانِ جنگ — (نقشہ نمبر ۲ دیکھئے) بدر گاؤں کا نام چشمۂ بدر کے نام پر پڑ گیا۔ یہ چشمہ زمین دوز چشمہ ہے جس کا بہاؤ بستی سے جبلِ عویش کے دامن سے ہوتے ہوئے نخلستان کی طرف ہے۔ بدر کا میدان تقریباً ۵ میل لمبا اور ۴ میل چوڑا ہے۔ اطراف میں بلند پہاڑ ہیں۔ تک۔ شام اور مدینہ جانے والے وادیوں والے راستے یہیں ملتے ہیں۔ یہ میدان سنگلاخ یا ریتلا ہے مگر جنوب مغربی حصّہ کی زمین نرم ہے (بدر کو اب تک موٹر نہیں جا سکتی ہے۔ کیونکہ راستہ میں متعدد بلند گھاٹیاں ہیں اور بہت نرم ریت ملتی ہے)۔ جنگ بدر سے پچھلی رات بارش ہوئی تھی تو یہ مقام جہاں قریش کا پڑاؤ تھا دلدل بن گیا تھا اور آب

وہیں ایک سرسبز نخلستان ہے، اطراف کے پہاڑوں میں سے دو سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان سفید پہاڑوں میں سے ایک کو اَلْعُدْوَةُ الدُّنْیَا اور دوسری کو اَلْعُدْوَةُ الْقُصْوٰی کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جنوب مغرب میں جو بہت اونچا پہاڑ ہے اُسے اب جبلِ اَسْفَل کہتے ہیں (اس کے پیچھے دس بارہ میل پر بحرِ احمر ہے)۔ میدان کے بیچ میں بستی سے ملحق ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے (جبلِ عریش) جس پر ایک عریش یعنی جھونپڑی ہے (آج اس مقام پر ایک یادگار مسجدِ عریش کے نام سے موجود ہے) آنحضرتؐ میدانِ جنگ کو دیکھ سکتے رہے ہوں گے (آجکل باغوں اور کھجوروں کے اونچے درختوں کی وجہ سے معرکہ کارزار نہیں نظر آتا)، اسی میدان میں زمانۂ جاہلیت کا سالانہ ہفتہ بھر کا ایک بڑا میلا بھی لگا کرتا تھا۔

غالباً آنحضرتؐ نے اَلْعُدْوَةُ الدُّنْیَا سے آگے بڑھ کر جبلِ عریش کے قرب وجوار میں چشمہ کے کنارے پھر پڑاؤ ڈالا۔ دشمن کا پڑاؤ اسی چشمہ کے نیچے کی طرف اَلْعُدْوَةُ الْقُصْوٰی کے پاس تھا۔

فوجی ترتیب — ایک بہتر صف بندی کے بغیر عام حالتوں میں مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں جاری رہ سکتا۔ امام ترمذی کے مطابق اسلامی فوج کی تقسیم لڑائی سے پہلے کی رات ہی کو عمل میں آچکی تھی۔ واقدی اور طبری نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج تین مستقل جماعتوں پر مشتمل تھی۔ مہاجرین۔ اَوس اور خزرج اور ہر ایک کا علمبردار بھی الگ تھا۔ لڑائی کے دن (۱۷ رمضان ۲ھ) سویرے ہی آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو اصولِ جنگ کے مطابق قطاروں میں تقسیم کیا۔ اور جنگ سے پہلے صف بندی کا تنقیدی نظر سے معائنہ کیا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ کوئی سپاہی ذرا بھی آگے پیچھے نظر آتا تو آپ اسے فوراً درست کرتے۔ اس صف بندی کے بعد آپ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر مقرر کئے۔ واقدی کے مطابق میمنہ پر حضرت ابوبکرؓ تھے۔ ساقہ (یعنی پیچھے) کے اہم دستہ پر قیس المازنی (انصاری) کو مامور کیا گیا تھا۔ (طبری)

صف بندی کے بعد آنحضرتؐ نے سپاہیوں کو چند اہم ہدایات دیں کہ مسلمان اس صف بندی کو نہ توڑیں اور اس وقت تک لڑائی کا آغاز نہ کریں جب تک آنحضرتؐ اجازت نہ دیں۔ دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضائع نہ کریں۔ زد پر آئے تو تیر چلائیں۔ اور بھی قریب آئے تو پتھروں سے ماریں۔ (پتھر اسلامی کیمپ کے پاس ٹیلہ اور ریلیٹو پر کافی مقدار میں تھے) اس سے بھی نزدیک ہو جائے تو نیزوں سے روکیں اور

سب سے آخر میں تلواریں کھنچیں۔ سپاہیوں کے پاس کوئی امتیازی وردی نہ تھی اس لئے "یا منصور اَمِت" کا جملہ ان کا شعار مقرر کیا گیا تاکہ دوست دشمن کی تمیز ہو سکے۔ محدثین اور مورخین کا بیان تو یہاں تک ہے کہ بدر میں قیام کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے اپنے ممتاز افسروں کے ساتھ پھر کر میدانِ جنگ کا معائنہ کیا اور جگہ جگہ بتاتے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہو سکتا ہے اور اس کے مرکز بننے کی فلاں جگہ ہے سپہ سالارِ اعظم کا انتہائی خطرہ کے موقع پر یہ اطمینان اور یہ ایقان ماتحت افسروں اور ان کے ذریعہ پوری فوج میں جو خود اعتمادی اور جوش و ولولہ پیدا کر سکتا ہے ظاہر ہے۔ اور ساتھ ہی دشمن کی صلاحیتوں کا پیش اندازہ کرنا ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی جنگِ بدر کے موقع پر ایک اہم حربی ہدایت یہ آئی کہ "وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ" (انگلیوں کی جوڑوں پر مارو)۔ ظاہر ہے کہ دشمن کو لڑائی کے لئے ناقابل کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو حتی الامکان گھٹانے کی اس سے بہتر ہدایت کسی دست بدست لڑائی کے لئے نہیں دی جا سکتی۔ لڑائی اسی جگہ ہوئی جہاں اب قبرستان واقع ہے۔ یہاں عورتیں بھی مقرر تھیں جو زخمیوں کی مرہم پٹی کریں — اپنی صف بندی مکمل کرنے انتظام کی طرف سے مطمئن ہو کر آنحضرتؐ ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے جہاں سے میدان جنگ صاف نظر آتا تھا (علی تلٍ مشرف علی المعرکۃ)۔ اسی ٹیلہ پر آنحضرتؐ کے لئے ایک "عرش" (جھونپڑی) تیار کی گئی تھی (غالباً دھوپ اور تیروں سے بچاؤ کی خاطر)۔ یہاں چند تیز رفتار سانڈنیاں بھی متعین کی گئی تھیں (ابن ہشام) تاکہ فوج کو ہدایات بہم پہنچانے میں آسانی ہو یا مدینہ کی راہ پکڑنے میں بروقت سہولت ہو۔ طبری کے مطابق عرش پر ایک محافظ دستہ کا پہرہ بھی تھا۔ رسولِ کریمؐ نے اس موقع پر نہایت عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے دعا فرمائی: "اب تیری وہ مدد آجائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت کہیں نہ ہو گی۔"

اس معرکہ میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرین مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ اور تلواروں کی زد میں آ رہے تھے۔ انصار کا امتحان بھی کم سخت نہ تھا۔ کیونکہ اب تو وہ کھل کر اسلام کی اعانت میں جنگ کرنے کے لئے نکل آئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اپنی بستی مدینہ کے خلاف

سارے عرب کو دشمن بنا لیا تھا۔ حالانکہ مدینہ کی آبادی چند ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اِس امتحان میں پختہ ایمان ہی ٹھہر سکتے تھے

دشمن کی تنظیم کا زیادہ پتہ نہیں ملتا۔ واقدی کے مطابق ان کا میمنہ و میسرہ دو حصّے تھے اور فوج میں تین جھنڈے تھے۔ انھوں نے پیش قدمی کر کے ایک خاص مقام پر توقف کیا (نقشہ نمبر ۲ دیکھئے) پھر اپنے زمانہ کے جنگی رواج کے مطابق مبارزہ کیا (یعنی ان کا ایک بہادر صفوں سے آگے بڑھا اور دعوت دی کہ مسلمانوں کا بھی ایک پہلوان آگے بڑھے اور دونوں تنہا لڑیں) قریش میں یہ کمزوریاں تھیں کہ اوّل تو ان میں باہم اتفاق نہ تھا۔ اُن کی فوج میں کوئی ترتیب و صف بندی نہ تھی۔ وہ اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے (یَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ" (آل عمران) ـــ (وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے)۔ دوسری طرف پچھلی رات بارش ہو جانے کی وجہ سے بالائی حصّہ میں جہاں مسلم کیمپ تھا پانی کے ذخیروں کے علاوہ (جن کو وضو و غسل کے لئے استعمال کر سکتے تھے) ریت جم گئی جس سے زمین سخت ہو جانے سے قدم جمنے اور نقل و حرکت میں آسانی پیدا ہو گئی۔ برخلاف اس کے نشیبی حصّہ میں جہاں قریش کا کیمپ تھا کیچڑ ہو گئی اور پاؤں دھنسنے لگے۔ بارش ہو جانے سے بالائی حصّہ والے رات کو اطمینان سے سوئے اور صبح کے وقت تازہ دم تھے۔ برخلاف اس کے نشیبی حصّہ والے رات بھر بے اطمینانی کی وجہ سے سو نہ سکے اور صبح تھکے ہوئے اور سست تھے ـــ

لامحالہ لڑائی شروع ہوتے ہی قریش کے پیر اکھڑنے لگے۔ بالآخر ان کا ایک عام حملہ ہوا تب رسولِ کریم نے تیروں کی بارش کا حکم دیدیا۔ ان تیروں نے سواروں کو گھوڑوں سے اتار پھینکا۔ اور کتنے گھوڑے مر گئے اور پیادہ فوجوں کی صفوں کو بھی توڑ دیا۔ غرضکہ وہ ایسے بدحواس۔ ہراساں اور منتشر و سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ اپنی ہی کمندیں طوقِ گردن بنی ہوئی تھیں۔ بھاگنے والے بوکھل ہو کر اپنے جھلم خود۔ زرہیں اور دیگر ہتھیار پھینکتے جاتے تھے جنھیں مسلمان سپاہی اٹھاتے جاتے تھے۔ اور باطل کی جمعیت کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ

غرور و ناز تھا جس قوت نا پاک کے اوپر وہ قوت ہر طرف بکھری پڑی تھی خاک کے اوپر

نتائج ۔ مسلمانوں کو خدا نے کامیابی عطا فرمائی اور قریش ہار گئے حالانکہ مقابلہ ایک اور تین کا تھا! قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ (آلِ عمران) (ان دو مخالف گروہوں میں تمہارے سمجھنے کے لئے نشانی ہے جو ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ ان میں سے ایک تو وہ تھا جو خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکروں میں سے تھا)۔ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ اشخاص نے شہادت پائی ۶ مہاجر اور ۸ انصار (دیکھئے نقشہ بُرج میں ان شہدائے بدر کی چوکھنڈی)۔ قریش کے تقریباً ۷۰ آدمی مارے گئے اور اتنے ہی قید ہوئے (ابن ہشام)۔ مارے جانے والوں میں ان کے قبائل کے بڑے بڑے سردار اور اسلام کی مخالفت پر ابھارنے والے نامور ان تقریباً سب ختم ہو گئے مثلاً شیبہ۔ عتبہ۔ ابوجہل۔ اُمیہ وغیرہ۔ ان کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی۔ اور تحریک اسلامی کی جڑ مضبوط کر دی۔ قرب و جوار کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک جم گئی اور مدینہ میں منافقین و یہود کو بھی کچھ ڈھیلا کر دیا۔ اُدھر مکہ میں شکست خوردہ مشرکین کی واپسی پر کہرام مچ گیا۔ ہر گھر ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔

اپنے شہداء کو سپردِ خاک کرنے کے ساتھ ہی دشمن کی لاشوں کو بھی رسول کریمؐ نے پاس ہی کے ایک پرانے وسیع کنویں (قلیب) میں دفن کرا دیا۔ اور فوراً دو تیز رفتار خوشخبری دینے والے مدینہ کے محلۂ عالیہ اور سافلہ کی طرف روانہ کر دیئے تاکہ وہاں کے لوگ بھی لڑائی کے انجام سے واقف ہو جائیں۔ بدر کی جنگ میں جاتے وقت آنحضرتؐ اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کو چیچک میں مبتلا چھوڑ کر چلے گئے تھے (ان کے شوہر حضرت عثمان بن عفانؓ بھی رہ گئے تھے)۔ جس روز اور جہاں ان کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی وہیں فتح کی خبر آئی۔

قیدیوں کے ساتھ عام طور پر عمدہ سلوک کیا گیا۔ دو دو چار چار کر کے صحابہ میں تقسیم کر دیئے گئے۔ بہت سے لوگ فدیہ دے کر رہا ہو گئے۔ ایک ہتھیار فروش (نوفل بن حارث) سے ایک ہزار اسلاحات نیزے فدیہ ۲۲

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

دعوت و اقدام

قرآن کے ایک طالب علم کے قلم سے

بات سے بات نکلتی ہے

(۱)

اگر تاریخ قوموں کی نفسیات اور نفسیاتی عوامل کا نام ہے تو ہمیں اس کے مطالعہ سے ان محرکات کا علم حاصل ہوتا ہے جو قوموں کا بقاء و تحفظ اور ترقی کا سراغ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر منفی شکل میں تاریخ کا ورق الٹا دیا جائے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ قوموں کے زوال و انحطاط میں کون سے نفسی عوامل کام کرتے ہیں۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ مسلمانوں کے تقدم اور پیشروی کی لِم معلوم کرنے کے لئے اسلام کی داخلی تاریخ سے جو رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے وہ خارجی تاریخ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر دنیا کی تاریخ کے ذخائر کو ریا بُرد کر دیا جائے اور صرف ایک قرآن باقی رہ جائے تو تاریخ کا مقصد اس سے بدرجۂ اتم حاصل ہو سکتا ہے قرآن اللہ تعالیٰ کا ابدی کلام اور انسانیت کا دائمی دستور العمل ہے اور یہ پوزیشن اسے اس وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ تاریخ کے بنیادی اصولوں پر بھی حاوی ہو اور قوموں کے قوانین نفس کو اپنا اسلوبِ بیان کا عنوان بنائے، یہ اس کتاب کا کمال ہے کہ اس نے ذہنوں

...عوض فدیے مانگے گئے۔ جو غریب تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس شرط پر رہا کر دیئے گئے کہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ چند کو اس اقرار پر مفت بھی رہا کر دیا گیا کہ آئندہ مسلمانوں سے نہ لڑیں گے۔

اس جنگ نے یہ ظاہر کر دیا کہ اسلام اور کفر میں دراصل جینے کا حق کسے ہے۔ اس اعتبار سے یہ پہلا معرکہ بہت عظیم الشان معرکہ شمار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی سورہ انفال میں اس معرکہ پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے پیرووں کی تربیت کس انداز پر ہوتی ہے۔

سہ روزہ دعوت کی خصوصی پیشکش

کے گرنے اور ابھرنے کے سے تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی تعبیر اختیار کی ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان قوم کے گرنے اور ابھرنے کے اسباب معلوم کریں تو ہمیں قرآن کریم کی داخلی تاریخ سے مدد لینی ہوگی کیونکہ مسلم شریف کی ایک حدیث قرآن کے تاریخی کردار کو یرفع اقواما و یضع به آخرین کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

موضوع بحث یہ ہے کہ آفاقیت اور انسانیت کے لئے اسلام کی حیثیت کیا ہے اگر حیثیت متعین ہو جائے تو ہم آسانی سے معلوم کر سکیں گے کہ عہد اول اور عہد آخر کے مسلمانوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔ ایک عہد کے مسلمان انسانیت کے پیشرو کیوں بنے؟ اور دوسرے عہد کے مسلمانوں نے کن عوامل سے مجبور ہو کر پسپائی اختیار کی یہیں سے اس بحث کا بھی آغاز ہوتا ہے کہ اسلام کے مزاج میں اقدام ہے ہجوم ہے جارحیت ہے یا اس کے خلاف دفاع ہے، بچاؤ ہے، تحفظ ہے۔

(۲)

قرآن اس حقیقت پر شاہد ہے کہ کائنات کا خالق رب العالمین ہے، اس نے کائنات اور انسانیت کے رشتہ کو سمجھانے کے لئے۔ جو ہدایت نامہ نازل فرمایا ہے وہ لیکون للعالمین نذیراً ہے اس ہدایت نامہ کو عمل میں لانے کے لئے جس انسان کامل کی ضرورت تھی اسے بھی رحمۃ للعالمین بنایا گیا ہے۔ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اسلام جس آفاقی نظام کا علمبردار ہے وہ دنیا میں صرف اس لئے آئے کہ دفاع اور بچاؤ کا فرض انجام دیتا رہے اور جس کی پہلی بولی یہ ہو کہ لوگو! تمہاری جارحیت مسلم ہے مگر میری پوزیشن بھی دفاع سے آگے نہیں جاتی، میرا پیغام ایک دعوت ہے مگر اس "دعوت" سے دعوکا نہ کھانا کہ میرے اندر اقدام ہے، یا پہل کرنا دعوت کے ہم معنی ہے، اگر اسلام صرف دفاع کی نوید جاوید لے کر آیا ہے تو افسوس اس نے بے کار زحمت اٹھائی، اگر وہ نہ آتا تو کائنات کے نظام میں کیا فرق پڑ جاتا، مگر یہاں یہ بات ظاہر کر دینی بھی ضروری ہے کہ ہم اسلام کے مزاج کو جن الفاظ کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں وہ اصل مفہوم و معنی کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، جارحیت (AGRESSION) آجکل ایک سیاسی اصطلاح بن گئی ہے اور بہت سی

مکروہ باتیں اس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں، اس لفظ میں جہاں اقدام کا مفہوم شامل ہے وہاں ظلم، زیادتی، خودغرضی، استحصال، کمزوروں کی پامالی کا مفہوم بھی شامل ہے، حالانکہ اسلام اس معنی میں جارح نہیں ہے، وہ تو ایسا جارح ہے جو جارحیت کے موجودہ نقائص کو دور کرنے آیا ہے، اگر ظلم، ناانصافی، خودغرضی اور استحصال سے بغاوت کرنے کا نام جارحیت ہے تو ہمیں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "دعوت" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں مل سکتا، جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام داعی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے ہر وہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے جو دفاع اور بچاؤ کی نفی کرتا ہو، ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام دفاع اور بچاؤ کے لئے نہیں آیا، اس منفی مفہوم کو جو لفظ بھی مثبت میں تبدیل کر سکے اسے ہم غیر مشروط طور پر استعمال کر سکتے ہیں، رہنمائی، اقدام، پہل، دعوت، تحریک، جارحیت، تبلیغ میں سے کوئی لفظ منتخب کر لیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس مفہوم کو ادا کر رہا ہے، مقصد تو یہ ہے کہ اسلام کا نظام کار دفاع سے میل نہیں کھاتا، وہ اس لئے نہیں آیا کہ ہر آندھی کے ساتھ اڑے اور ہر سیلاب کے ساتھ پھرے، وہ خود آندھی ہے، خود سیلاب ہے۔ مگر تعمیری آندھی اور تعمیری سیلاب "جاء الحق وزهق الباطل" گویا "حق" کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں اقدام اور پہل کرنے کی طاقت ہو، وہ آگے بڑھے اور اس کی ایک ہی ٹکر سے باطل پاش پاش ہو جائے، حق کے معنی ہیں وہ چیز جو مختلف زمانوں میں باقی رہے اور ہر زور کی طاقت کو چیلنج کر سکے۔ حق شحنہ ہے اور باطل چور ہے۔ شحنہ یہ انتظار نہیں کرتا کہ چور حملہ کرے تو وہ دفاع اور بچاؤ کے کرتب دکھلائے، اگر حملہ نہ کر سکے تو شحنہ صاحب تماشہ ہی دیکھتے رہیں، چور بھاگتا ہے تو اس کا تعاقب کیا جاتا ہے، اس پر غلبہ پانے کی کوشش کی جاتی ہے، چور اپنا دفاع کرتا پھرے، لیکن سپاہی کا کام دفاع نہیں تعاقب ہے، بچاؤ نہیں اقدام ہے، اسلام کی نظر میں باطل ایک خوفناک قسم کا چور ہے اور حق ایک ایسا سپاہی ہے جو اس کا تعاقب کرتا، اس پر غلبہ پاتا اور اس کو سزا دیتا ہے۔
هذا كتابنا ينطق عليكم بالحق وما بعد الحق الا الضلال۔

(۳)

ان سطور سے جو مقصد پیش نظر ہے اگرچہ اس کی راہ میں مصلحتوں کے پہاڑ حائل ہیں پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

" اشارات کی زبان کو مجاز کے بجائے حقیقت کے لئے استعمال کریں، اور اس کا آغاز ہم اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نظام باطل کے خلاف ایک چیلنج ہے، ظلم کے خلاف ایک انتباہ ہے، بداخلاقی اور بداطواری کے خلاف ایک تازیانہ ہے، اور ساتھ ہی نیکی، بھلائی، انسانیت، مساوات، سچائی، ہمدردی، خداترسی، رحمدلی کی ایک جارحانہ "دعوت" اسے آپ تحریک کہہ لیجئے، مگر اسے دفاع اور بچاؤ کا نام نہ دیجئے، قوموں کے نفسی عوامل کی اعلیٰ تصریح یہ ہے کہ جب مسلمان دفاع کی پوزیشن میں آئے، اسی وقت سے انہیں زوال آیا، اور اپنے تحفظ و بقا کی فکر پڑ گئی، وہ جس پونجی کو تقسیم کرنے آیا تھا، اسی کی حفاظت میں مصروف ہو گیا اور نتیجہ میں اپنی جان بھی گنوا بیٹھا، خاتم المرسلینؐ اور صحابہ کبارؓ کو کیا مجبوری پیش آگئی تھی کہ قیصر و کسریٰ کا نام لے کر اپنے عزائم کا نقشہ بناتے رہے، اور کم سے کم مدت میں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں جا دھمکے، انہیں تو دفاعی پوزیشن پر قائم رہنا چاہئے تھا، جان بچی لاکھوں پائے، یہ کیا بے صبری تھی کہ تحفظ کی چادر کو تار تار کر بیٹھے۔ اور آغاز ہی میں دنیا کو اپنے عزائم سے آگاہ کر دیا کہ اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده واذا هلك قيصر فلا قيصر بعده ذیل کی آیت پر غور کر کے بتایئے کہ اسلام دفاع کے لئے آیا ہے، یا حق اور سچائی کو غالب کرنے کے لئے، اور ایک مسلمان کا مشن یہ ہے کہ وہ تحفظ کی بھیک مانگے، یا ہجوم و اقدام کی سربراہی میں ابتدا کرکے اپنے لئے، وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین کا نیا آسمان اور نئی زمین بنائے اور خود کو قیادت کا اہل ثابت کرے؟ وہ آیت یہ ہے هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ایک طرف دفاع ہے، دوسری طرف لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہے، ان میں سے اسلام کس کا انتخاب کرتا ہے؟ سلامتی اس میں نہیں کہ آپ سلامتی کی بھیک مانگیں۔ دفاع کا مطلب کیا ہے؟ جان بخشی کے لئے استدعا کرنا، اپنی بقا کے لئے دوسروں سے اجازت لینا اور اپنی محکومیت اور زیردستی پر قناعت کر لینا، مخالف چاہے تو ہماری استدعا منظور کرے، نہ چاہے تو رد کر دے، دوسروں کو انا احی و امیت کا نعرہ دینے والے سن لیں کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ نظام حیات کا نقشہ اسلام کے ہاتھ میں ہے، یہ دولت صرف اسلام ہی کے آستانے سے تقسیم ہوتی ہے، اسلام نظام حیات کا سرچشمہ دوسروں کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتا، اگر آپ بچوں کے ہاتھ میں

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

یا سلائی نہیں دے سکتے تو نظامِ زندگی کا آبگینہ بھی دوسروں کے حوالہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴)

اسلام نے دینِ الحق کا مقصد لیظہرہ علی الدین کلہ بتایا ہے، اس کے کسی گوشہ میں آپ کو دفاع نظر آتا ہے، کیا دفاعی پوزیشن کے بعد بھی لیظہرہ علی الدین کلہ کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی دو جگہ فرمایا ولو کرہ الکافرون اور ولو کرہ المشرکون، جو دینِ حق ولو کرہ الکافرون کی وادیوں کو عبور کرتا ہے اسے جاں بخشی کی پوزیشن میں اس وقت ڈالا جا سکتا ہے جب سارے قرآن کی اسپرٹ کو ختم کر دیا جائے، پھر یہی قرآن مسلمانوں کے موقف کی وضاحت اس طرح کرتا ہے: ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر (تم میں ایک ایسی جماعت موجود رہنی چاہیے جو خیر اور بھلائی کی طرف بلائے اور معروف کا حکم کرے اور منکرات سے روکے) اگر اقدام اور جارحیت کا مفہوم اس زمانہ میں خطرناک کہا گیا ہے تو یدعون الی الخیر سے یہ خطرناکی رحمت و رافت سے بدل جاتی ہے مگر جس بات پر زور ہے وہ یامرون بالمعروف ہے، معروف کو حکماً پھیلاؤ اور منکرات کو حکماً روکو، اگر مسلمان کا موقف یہی ہے تو اسی کا نام تحریک اور دعوت ہے، اور اس کو اقدام اور سبیل سے موسوم کر سکتے ہیں، اسی دعوت و اقدام کی وجہ سے مسلمانوں کو کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر بہترین امت کا خطاب دیا گیا ہے، اور جب تک آپ کے ہاتھ میں نظامِ حیات کی باگ ڈور نہ ہو آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

پھر یہ بھی غور کیجئے کہ مسلمانوں کو جو شہداء علی الناس کہا گیا ہے وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس (ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہی دو) یہ نوعِ انسانی پر گواہی دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا دفاع کرنے والی قوم بھی شہداء علی الناس کے منصب جلیلہ پر سرفراز ہو سکتی ہے؟ ذرا شہداء علی الناس کے زور کو دیکھو۔ دعوت و اقدام کا پورا مفہوم ذہن نشین ہو جائے، اور یوں بھی سارے قرآن کا مطالعہ کر جائیے کسی جگہ آپ کو نظر نہ آئے گا کہ اسلام سے باہر کی دنیا کو مسلمانوں پر گویا چھوڑ دیا گیا ہو، خدائے تعالیٰ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں پر انحطاط کا دور بھی آئے گا اور وہ

اپنی اندرونی توانائی سے اپنے کردار کی بنا پر محروم کر دیے جائیں گے، اس پر بھی قرآن نے ایسے احکام نہیں دیئے جو صرف کمزوروں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں حالانکہ ایسے ایسے احکام ضرور دیئے جاتے تھے جب وضو کا بدل تیمم ہو سکتا ہے، تو حاکمانہ احکام کا بدل محکومانہ احکام کیوں نہیں ہو سکتے، لیکن اگر اسلام ایسے احکام دیتا تو کمزوری یا دفاعی ضابطہ کی چیز بن جاتا۔ اسلام کسی عبوری دور کو جس میں دفاع کی ضرورت پڑتی ہے، ضابطہ میں لانا نہیں چاہتا، اس کا دائمی ضابطہ جو امر، حکم، اقدام، پہل، تحریک، دعوت کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ دائمی ضابطہ میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسلام ایک مستقل دعوت ہے اور صاحب قرآن داعی الی اللہ کے منصب پر فائز ہیں اور مسلمانوں کو تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر کی قوت بخشی گئی ہے اور اسلام کا مقصد لیظہرہ علی الدین کلہ بتایا گیا ہے، تو اسلام اور مسلمانوں کی اس سربراہی اور ذمہ داری کو آپ کن الفاظ میں ظاہر کریں گے؟ اس کے لئے کم از کم دفاع، بچاؤ اور تحفظ وغیرہ الفاظ تو کام نہیں دے سکتے، اگر جارحیت سے وہ عنصر خارج کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ لفظ بدنام ہے اور اس کی جگہ خیر اور معروف کا عنصر داخل کر دیا جائے تو تسلیم کیجئے کہ اسلام کی حقیقی اسپرٹ جارحیت ہے، یا پھر لفظ دعوت ہی کا انتخاب کیجئے تاکہ اصطلاح کی غلطی مقصد کو غلط معنی نہ پہنا سکے!

نامناسب نہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط کا ذکر بھی اگر ہو جائے جو آپ نے شاہان وقت کے نام لکھے۔ اس سے مقصد کی وضاحت زیادہ مکمل طور پر ہو جائے گی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ بلغ ما انزل الیک من ربک (تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ اتارا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو) اور یہ تنبیہ بھی فرمائی گئی کہ وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (اگر تم آمادہ نہ ہوئے تو تم فریضۂ تبلیغ ادا کرنے سے قاصر رہے) تو آپ نے اپنی دعوت کے لئے سب سے پہلے ان شخصیتوں کو منتخب کیا جو اس زمانہ میں بدترین قسم کے سامراجی تھے اور ساتھ ہی انتہائی طور پر توانا اور طاقتور بھی، آپ نے فرداً فرداً اپنی جانب سے شاہ حبش قیصر روم، شاہ ایران، حاکم مصر، رئیس بحرین، شاہ عمان، شاہان حمیر کے نام خطوط لکھے اور ان کے ذریعہ ان کو دعوت اسلام دی، کیا ان تمام دعوتوں میں آپ کو دفاع نظر آتا ہے، یا پہل اور اقدام کی کرن۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

نبی اکرمؐ چشمۂ نور تھے

الاستاذ محمد الغزالی (قاہرہ)

ترجمہ محمد سلیمان فاروقی

جہالت ایسی تاریکی ہے جس کو صرف علم کی روشنی ہی مٹا سکتی ہے۔ پستی و ذلت ایسی تاریکی ہے جس کو مٹانے کے لئے فضیلت کی روشنی درکار ہوتی ہے۔ اضطراب نفس ایسا پردہ ہے جس کو شعاع حقیقت چاک کر سکتی ہے۔ بغاوت و سرکشی کو مٹانے کے لئے عدل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ کو بھول جانا اور اپنے آپ کو بھلا دینا اس تاریک رات میں گم ہو جانا ہے جس میں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اس غفلت کو ختم کرنے کے لئے ایمان کی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس پردہ کو وسیع و عریض نور ہی چاک کر سکتی ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس روشنی کا چراغ تھے جو انسانیت کے افق پر روشن ہوا جس طرح کہ سورج آسمان کے وسط میں چمکتا ہے۔ اس نور کے متلاشی جب اس نور کو پاتے تھے تو اپنے دلوں میں اس کے

موجود دکھائی دیتی ہے، یہ جو آپ نے ہر بادشاہ کو اسلم تسلم (اسلام قبول کرو تاکہ تم کو سلامتی ملے) کا حکم دیا تو اس کا مطلب کیا ہوا؟

خلاصہ یہ کہ جب مسلمان اپنی کمزوریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے دفاعی پوزیشن میں آ گئے، وہ منہ کے بل گرے، ان کا زوال شروع ہوا اور انہیں پسپا ہو کر راہ فرار اختیار کرنی پڑی، اسلام کی فطرت ہجوم و اقدام ہے۔ دعوت اس کا سرمایہ ہے، اگر یہ نہیں تو ملت کا زوال ناگزیر ہے آج عالم اسلام رجعت قہقری کی منزل میں ہے، جس کا دوسرا نام دفاع اور فرار ہے، آپ مانیں یا نہ مانیں زوال امت کا واحد سبب یہی ہے البتہ اس فن کی تشریح بہت مطول اور مفصل ہے جسے اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے انداز میں ترتیب دینا اسلامی مفکرین کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

اثرات کو اخذ کر لیتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں نے عرصۂ دراز کی گمراہی و ضلالت کے بعد اس نور کو پایا تھا اور مومنین کی جماعت میں شریک ہوئے تھے اس لئے ان کو زندہ دل شمار کیا جاتا تھا۔

جس طرح قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے۔

"اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمَاتِ" (یعنی اللہ مومنین کا سرپرست و نگران ہے اور وہ ان کو گمراہی کے راستہ سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لاتا ہے۔ اور کافرین کے سرپرست اور اولیا شیاطین ہیں جو ان کو صراطِ مستقیم کی روشنی سے نکال کر ضلالت کی تاریکیوں میں پھنسا دیتے ہیں۔)

مومنین کی تمیز اس طرح پر کی جاتی ہے کہ وہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ لوگ کمل نوری ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ اس وقت دین کے بارے میں علم رکھتے ہیں جب کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں نہیں جانتے ہوتے ہیں اور وہ اس وقت کے ان لوگوں کے مقابلہ میں دین کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ اس کو بالکل نہیں سمجھتے اور ان لوگوں کو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اس ہدایت و نبیؐ کی طرف سے شک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عدل کی راہ کو اختیار کرتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ ظلم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں اللہ کے اور نفس کے حقوق کو پورا کرتے ہوئے جب کہ دوسرے لوگ اپنے رب کے حقوق کو بھلانے کی وجہ سے خود سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ فرق صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مسلمان اسلام قبول کرنے کے دن سے ہی جہالت، پستی، شک، گمراہی اور تاریکی سے نکل کر ٹھیک شاہراہ پر چلنے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن اس آیت میں اشارہ کرتا ہے۔

"أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" (کیا وہ لوگ کہ جن کے دل مردہ ہو گئے تھے تو ہم نے ان کے مردہ دلوں کو اس نور کے ذریعہ زندہ کیا جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو تاریکی میں چلا جا رہا تھا اور اس سے نکلنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا کہ اچانک اس کو روشنی مل گئی)

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

اسلام ایسا نور ہے جس کے ذریعہ افراد اور قبائل ہدایت پاتے ہیں۔ اس کے لئے قرآن کی چند آیات پیش کروں گا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ "اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کے واضح دلائل آگئے تم ان پر ایمان لاؤ" اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہاری طرف قرآن نازل کیا تم اس سے ہدایت حاصل کرو۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔" (تمہارے پاس اللہ کا نبی آیا اور اس کے پاس ایسی کتاب ہے جس میں روشن دلائل موجود ہیں) "اے نبی ہم نے آپ کو گواہ، بشیر، نذیر اور داعی الی اللہ اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے (تاکہ لوگ ایمان لائیں" (قرآن) "البتہ ہم نے نبی کو چشمۂ ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور ہم اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتے ہیں ان کے ذریعہ سے ہدایت دیتے ہیں" (قرآن) "وہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کتاب پر ایمان لائے جس کو ہم نے نازل کیا تھا۔" (قرآن) "اللہ نے تمہاری طرف یاد دلانے والا یعنی رسول کو بھیجا جو تمہارے سامنے اللہ کی واضح نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ وہ ان مومنین کو تاریکی سے نور میں نکال لائے جو عمل صالح کرتے ہیں" (قرآن)

اور مومن جس حد تک حق کے بارے میں اپنے افکار و شعور میں صفائی و ستھرائی پیدا کرے گا اور جس حد تک بصیرت و روشنی سے اسکی خطاؤں میں کمی ہوگی اسی حد تک وہ آخرت کے گھر اور ابدی منزل کی طرف راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ اہل خیر پورے وثوق سے منزل مقصود تک پہنچنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

"قیامت کے دن اللہ نبی کو اور اس کے اہل ایمان ساتھیوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے چاروں طرف ہوگا اور وہ اپنے رب سے کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہم کو بخشدے بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (قرآن) رہے وہ لوگ جنھوں نے شرارت و بزدلی کی روش کو اختیار کیا اور اپنی عمروں کو عیش و عشرت کی رنگینیوں میں اپنے اندھے پن کی وجہ سے صرف کیا تو ان کے لئے کڑکنے والے بادلوں کی تباہی مسلط کی جائے گی اور ان کے راستے تاریک کر دئے جائیں گے یعنی ہر طرف ان کی زندگیوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا تو ایسے لوگ قیامت میں مومنین کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے اور کامیابی کی تمنا کریں گے

نادر و نایاب اسلامی جواہرات

تفسیرِ قادری ترجمہ تفسیرِ حسینی :۔ فارسی زبان میں ملا حسین واعظ کاشفی کی شہرۂ آفاق کی تفسیر قرآن اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث مقبول عام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا فخر الدین دہلوی نے کیا تھا جس کو مطبع نے متعدد بار شائع کیا۔ جدید ایڈیشن دو جلدوں میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اختصار کے باوصف یہ جامع تفسیر اردو داں قارئین کے لئے نادر تحفہ ہے۔ ابتدا میں قرآنی علوم پر ایک مفصل مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اعلیٰ طباعت۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت ۲۲ بائیس روپے

حدائق الحنفیہ :۔ پہلی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک جتنے بھی علمائے احناف روئے زمین پر گذرے ہیں اور مسلک حنفی کی کوئی خاص خدمت کی ہے ان کا مفصل تذکرہ۔ ہر صدی کے علماء کا حال علٰحدہ علٰحدہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔ بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت عہ ر

حدائق الاسلام :۔ یہ کتاب عام طور سے احسن المواعظ کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں ضروری مسائلِ شرعیہ کے علاوہ حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ کے فضائل و برکات، اصول و قواعد خطبات کی صورت میں ہیں۔ اعلیٰ طباعت۔ مضبوط جلد۔ خوشنما سرورق، بڑا سائز

قیمت :- ۸ر

احکام العیدان :۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے ضروری مسائل اور دعائیں۔ نماز کا طریقہ اور دیگر احکامات شرح و بسط سے موجود ہیں۔ قیمت :۔ چار آنہ ۔ ۴ر

دلائل الخیرات مع ترجمہ فارسی :۔ اوراد و وظائف کی مشہور کتاب مع ترجمہ فارسی طباعت عمدہ۔ سائز بڑا۔ قیمت :۔ عہ ر

ملنے کا پتہ :۔

مینیجر (راجہ) رام کمار بکڈپو۔ وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ

مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از :-
علامہ محمد اسد

یہ عصر کا وقت ہے اور میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اس کے کھجوروں کے باغ میں بیٹھا ہوں جو عین مدینے کے جنوبی دروازے کے باہر واقع ہے۔ کھجوروں کے پیڑوں کے ایک وسیع ہجوم نے پس منظر پر ایک سبزی مائل بھوری شفق کی چادر تان رکھی ہے جس کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ درخت ابھی چھوٹے اور اوائل عمر کے ہیں۔ اور پچھلے پہر کے سورج کی سیمیں روشنی ان کے تنوں اور ان کے طویل پتوں کی نوکدار محرابوں پر رقص کر رہی ہے۔ پیڑوں کا سبز لباس کسی قدر گرد آلود دکھائی دیتا ہے کیونکہ آجکل آندھیوں کا موسم ہے اور تقریباً روز ہی انہیں ریت کے بھرے ہوئے جھکڑوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ البتہ پیڑوں کے نیچے شاداب و دبیز گھاس کا خود سر دین قالین بچھا ہے۔ اس کی سبزی بالکل بے داغ اور چمکدار ہے۔

مجھے چند ہی قدم کے فاصلہ پر شہر کی قدیم اور بھوری دیواریں ایستادہ نظر آتی ہیں جو پتھروں اور گارے کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں اور جن میں جا بجا برج اور منارے باہر کی سمت بڑھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دیواروں کی اوٹ میں اندرونِ شہر میں واقع ایک باغ سے کھجوروں کے چند شاندار پیڑ جھانک رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی چند مکان بھی نظر آتے ہیں۔ جن کے بالائی شہ نشینوں کے قریب کھلنے والے دریچوں کے پٹ وقت کی یورشوں سے بھورے پڑ چکے ہیں۔ ان مکانوں میں کچھ مکانات عین فصیل شہر میں بنے ہوئے ہیں اور اسی کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مکانوں سے پرے کچھ فاصلے پر میری آنکھیں مسجد نبوی کے پانچ مینار دیکھ رہی ہیں۔ بلند اور رعنا، جیسے کسی مدھر گیت کی اونچی تان! اور اس کے بعد وہ عظیم سبز گنبد جس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھے سے پاکیزہ مکان کو ڈھانپ رکھا ہے جو زندگی بھر آپ کا مسکن رہا ہے۔ اور موت کے بعد آپ کا مرقد بنا۔ پھر اس سے بھی آگے جا کر میری نگاہیں شہر کے اُس پار اُحد کی عریاں سنگلاخ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

پہاڑیوں کے سرخ اور بھورے سلسلے پر پڑتی ہیں جس کے آگے شہر کے بے شمار مکانات کے ساتھ ساتھ مسجد نبوی کے دودھیائی منارے اور طویل قامت کھجوروں کے شاہانہ تاج بے حد دلکش منظر پیدا کر رہے ہیں۔

اور آخر دوپہر کے سورج کی چمکیلی دھوپ سے نکھرا ہوا آسمان منتشر بادلوں کے عقب میں ایک ٹھہرے ہوئے آئینے کی مانند نگاہوں کے سامنے ٹکا نظر آتا ہے اور تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ ان نرم و ملائم بادلوں سے کھیل رہے ہیں جو عرب میں بالعموم ایک دھوکہ بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ یہاں جب مطلع ابر آلود ہو تو کوئی شخص وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج بارش ہوگی۔ اکثر یہاں گھٹائیں خوب گھر گھر کر آتی ہیں۔ جن کے تن و توش کو دیکھ کر انسان بارش تو کیا طوفان تک کی توقع قائم کر لیتا ہے لیکن پھر بھی دیکھتے دیکھتے سینۂ صحرا سے تند و تیز ہواؤں کے بگولے لپکتے ہوئے آتے ہیں اور بادلوں کی بڑی سے بڑی فوج کو تتر بتر کر دیتے ہیں۔ تب ہلکے نیلے رنگ کا آسمان اپنے بے داغ مطلع کے ساتھ بڑی بے رحمی سے آنکھیں دکھانے لگتا ہے اور بارش کی امید سے شاداں و فرحاں لوگوں کے منہ لٹک جاتے ہیں اور وہ ایک عجیب اداسی کے عالم میں یہ بڑبڑا کر رہ جاتے ہیں کہ واقعی ہر چیز کی توفیق و قدرت صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔

میں اپنے دوست کو الوداع کہہ کر شہر کے بیرونی دروازے کی سمت چل دیتا ہوں۔ ایک شخص میرے قریب سے ایک گدھے پر سوار ہو کر گزرتا ہے۔ وہ اپنے آگے دو اور گدھوں پر سبز چارہ لادے ہنکائے لئے جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی چھڑی اٹھاتا ہے اور کہتا ہے "اللہ کی سلامتی ہو تم پر" جواباً میں بھی اسے یہی دعا دیتا ہوں۔ اس کے بعد میری مٹھ بھیڑ ایک نوجوان بدوی عورت سے ہوتی ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک طویل چغہ پہن رکھا ہے جو اس کے پیچھے گھسٹتا ہوا آ رہا ہے اور اس کے چہرے کا زیریں حصہ ایک نقاب سے ڈھکا ہوا ہے۔

میں شہر میں داخل ہو کر المناخاۃ کے وسیع و عریض چوک کو پار کرتا ہوں اور پھر باب مصر۔۔۔ میں سے گزر کر شہر کی اندرونی فصیل تک آتا ہوں۔ باب مصر کی عظیم محراب تلے ردپے کے تاجر بیٹھے سونے اور چاندی کے سکے کھنکھنا رہے ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھ کر میں شہر کے صدر بازار میں داخل ہوتا ہوں۔ یہ بازار بمشکل بارہ فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے دونوں طرف بارونق اور گنجان دوکانات کی آبادی ہے اور ان کے بیچوں بیچ

ایک مختصر مگر مشتاق و مضطرب زندگی کے زمزمے دھڑک رہے ہیں۔

خوانچے والے اپنے مال کی مدحت کے گیت بڑے پُرشوق انداز میں گا رہے ہیں۔ دوکانوں میں سجے ہوئے سروں کے خوشنما رومال اور دستار، ریشمی شال اور کشمیری اُون کے بنے ہوئے منقش لباس ہر راہگیر کی توجہ اپنی سمت جذب کر لیتے ہیں۔ زرگر اور سیم گر چھوٹی چھوٹی الماریوں کے عقب میں اکڑوں بیٹھے اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان کی الماریوں کی بلوریں دنیا میں بدویوں کے مخصوص پسندیدہ زیورات مثلاً چاندی کی چوڑیاں، چاندی کی جھانجھنیں، چاندی کے ہار اور کانوں کے بندے اپنے عمدہ سجاوٹ کے ساتھ گزرنے والوں کو دعوت نظر دے رہے ہیں۔ خوشبوئیں بیچنے والے اپنے خوانچوں پر حنا سے لبریز بڑے بڑے ظروف، سرموں سے بھری ہوئی ننھی ننھی سُرخ تھیلیاں مختلف روغنوں اور عطریات سے لبریز رنگا رنگ بلوری شیشیاں اور خوشبودار مصالحہ جات کے ڈھیر رکھے اِدھر سے اُدھر آجا رہے ہیں۔ کچھ نجدی تاجر جو ملک کے مشرقی حصہ سے آئے ہیں، بدویوں کے مخصوص لباس کی مختلف اشیا اور اونٹوں کے کجاوے اور کجاووں کے ساتھ آویزاں کئے جاتے والے سرخ اور نیلے رنگ کے لمبے لمبے جھالر دار تھیلے فروخت کر رہے ہیں۔ ایک پیشہ ور نیلام کنندہ اپنے کندھوں پر ایک ایرانی قالین اور اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی ایک عبا ڈالے اور بغل میں پیتل کا ایک سماوار دابے پورے زور کے ساتھ چلاتا بازار کے بیچ میں سے تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا گزر رہا ہے۔ بازار کی دونوں سمتوں میں لوگوں کا ایک عظیم سیلاب رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان میں مدینہ کے اصل باشندے بھی ہیں اور ملک کی باقی جگہوں سے آئے ہوئے لوگ بھی۔ پھر چونکہ حج کی مبارک تقریب حال ہی میں ختم ہوئی ہے۔ لہٰذا بازار میں دوسرے ممالک کے لوگ بھی کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان تمام ممالک کے لوگ جو افریقہ کے سینیگال اور ترکستان کے کرغیز کے میدانوں میں واقع ہیں۔ ایسٹ انڈیز اور ریجرا قیانوس کے علاقوں کے لوگ۔ استرخان اور زنجبار کے لوگ لیکن گزرنے والوں کے ایک عظیم اژدہام اور بازار کا راستہ خاصا تنگ ہونے کے باوجود حیرت ہے کہ تمام لوگ مہذب ہیں، کے جنون سے سراسر مبرا نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی کسی کو دھکا دیتا نظر آتا ہے اور نہ ہی ایک شخص دوسرے کو کہنی مار کر آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ

ہے کہ مدینہ کی مقدس فضاؤں میں طائرِ وقت کے لئے تعاقب کی اڑان ممنوع ہے :

پھر یہ بات اور بھی زیادہ عجیب ہے کہ مدینہ کے بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگوں کے مابین ان کے عظیم نسلی لسانی اور ملکی اختلاف کے باوجود کسی اجنبیت آمیز اختلاط کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ ان صوری و ظاہری اختلافات کی حقیقت صرف اس شخص پر ہی کھلتی ہے جو خاص طور پر اختلافات معلوم کرنے کی غرض سے ان کا بنظر غائر مطالعہ کرے۔ بصورت دیگر ایک عام تماشائی ان اختلافات کی موجودگی کا کوئی احساس از خود نہیں کر پاتا۔ اس کی بجائے دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لوگ جو سامنے چل پھر رہے ہیں خواہ وہ یہاں کے اصلی باشندے ہوں یا باہر سے آنے والے چند روزہ مسافر مدینے کے بازاروں میں داخل ہونے کے بعد یک لخت ایک ایسی سوسائٹی میں بدل جاتے ہیں جس کے انفرادی احساسات و جذبات میں ایک زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان تمام لوگوں کا مزاج، ان کا عام رویہ حتیٰ کہ ان کے چہروں پر جذبات کے ابھرتے مٹتے نقوش دیکھنے والی آنکھ کو حیرت انگیز حد تک یکساں و یک رنگ نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سب کے سب خدا کے اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرِ محبت کا شکار ہیں جس کا یہ کبھی شہر تھا اور جس کے یہ سب آج مہمان ہیں۔

پورے تیرہ سو سال گزر جانے کے باوجود اس دنیا کے کروڑہا دلوں کے محبوب نبیؐ کی روحانی ہستی آج بھی اس شہر میں اسی طرح زندہ و پائندہ ہے جس طرح سے کہ اس کی دنیاوی زندگی میں ہوا کرتی تھی۔ یہ محض اسی کی محبت کا صدقہ ہے کہ بے شمار منتشر قریوں کا وہ مجموعہ جسے کبھی یثرب کہا جاتا تھا۔ ایک شہر بنا اور پھر ابدالآباد تک کے لئے دنیا بھر کے مسلمانوں کے نزدیک بے پناہ عقیدت و محبت کا ایک مرجع قرار پایا کہ آج تک چشم فلک نے اس کی مثال نہیں دیکھی۔ درآنحالیکہ اس شہر کے نام کو اس محبوب کائنات کے ذاتی نام سے بھی کوئی نسبت اب تک نہیں دی گئی اور مسلمانوں کے ہاں اُسے زیادہ سے زیادہ مدینۃ النبی ہی کہا جاتا ہے۔

پورے تیرہ سو سال سے اس شہر کی فضاؤں کو دنیا بھر کے لوگ آ کر جس محیر العقول محبت و شیفتگی سے لبریز کر دیتے ہیں یہ اسی کا اثر ہے کہ اس شہر میں صورت و شکل، عادات و حرکات تمام اختلافات

بالکل مٹ جاتے ہیں اور تمام آنے والے زائرین ایک واحد کنبہ کی سی مشابہت اور یک رنگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کا سازِ حیات بالکل ہم آہنگی کے ساتھ زمزمہ نشاں ہوجاتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ کامل ہم آہنگی اور روحانی ہم رنگی کا یہ بے حد مسرت انگیز احساس مدینے کا ہر مسافر یہاں ہر آن اور ہر وقت محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ مدینہ کی موجودہ زندگی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے اور سکھلائے ہوئے طرز زیست سے ایک بالکل رسمی سی اور بہت بعید سی مشابہت رکھتی ہے اور اگرچہ دنیا کے دوسرے حصوں کی مانند یہاں بھی اسلام کی روح اُداس اُداس نظر آتی ہے۔ تاہم ان حقائق کے باوجود آج بھی ہمیں مدینے کے شہر میں اس کے عظیم اور شاندار ماضی کا ایک ناقابل بیان جذباتی رشتہ زندہ و استوار ملتا ہے۔ دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کوئی بھی شہر ایک ذات واحد کی خاطر لوگوں کی ایسی بے پناہ محبت و عقیدت کا مرجع نہیں بنا جیسی کہ محبت دنیا کے مسلمان مدینہ سے کرتے ہیں۔ اور پھر آج تک دنیا میں کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس کی ذاتی محبت اس کی موت کے تیرہ سو سال بعد تک بھی دنیا کی ایک عظیم ترین آبادی کے قلوب میں عین روز ازل کی مانند رگ و ریشہ بن کر پیوست ہو۔ سوا اس محبوب کونین کے جو آج شہر مدینہ کے ایک گوشہ میں اپنے عظیم روضہ کے سبز گنبد تلے محو خواب ہے

اور پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس شخص نے، اس محبوب کونین نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایک فانی انسان ہی کہا۔ ادھر مسلمانوں نے بھی آج تک اسے نعوذ باللہ کبھی خدا کی خدائی میں شریک نہیں بتلایا جس طرح کہ متعدد دوسرے انبیاء کے پیروکار ان کی موت کے بعد ان کے حق میں ایسا اعلان کر دیتے ہیں بلکہ اس کے برعکس خود اس ذات پاک کی لائی ہوئی الہامی کتاب بھی جا بجا اس بات پر زور دیتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک انسان ہیں اور خدا کی ایک مخلوق چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے

۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بس اللہ کے ایک رسول ہی ہیں۔ ان سے پیشتر (بھی) تمام رسول آئے اور گزر گئے۔ لہٰذا اگر یہ بھی فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو (اے ایمان والو) کیا تم راہ حق سے منہ موڑ لو گے۔ (مفہوم)

پھر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل بے چارگی کو واضح

کرنے کے لئے قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدو کہ میں تمہیں اچھی یا بری کوئی بھی چیز عطا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ، مجھے خود اپنی ذات کو نقصان یا نفع پہنچانے کی قدرت حاصل نہیں ہے۔ ماسوا اسکے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی ایسا چاہے (اور) اگر مجھے غیب کا علم حاصل ہوتا تو میں بہت سی بھلائی جمع کر لیتا اور کبھی کسی شر سے میرا سابقہ نہ پڑتا (لیکن اے لوگو) میں تو صرف ایک ڈرانے والا اور ایک خوش خبری دینے والا (پیامبر ہی) ہوں۔ ان لوگوں کے لئے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہی تھے اور وہ بالکل دوسرے انسانوں کی مانند رہتے سہتے تھے اور اسی اعتبار سے وجود انسانی کی تمام مسرتوں اور صعوبتوں میں بنی نوع انسان کے ساتھ مساویانہ شریک تھے۔ لہذا اس قدرتی اور فطری سبب سے وہ تمام لوگ جو اُن کے ہم جلیس تھے یا آج ان کے نام لیوا ہیں ان کی ذات کے ساتھ بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

اس محبت کے شعلہ کو انکی موت کا سرد ہاتھ بھی نہ بجھا سکا۔ اور یہ ابتک انکے کروڑہا نام لیواؤں کے قلوب میں زندہ و تابندہ ہے۔ اس عظیم نغمہ کی مانند جس کے تار پود میں موسیقی کی بے شمار تانیں گھل مل چکی ہوں۔ یہ محبت شہر مدینہ میں ایک ابدی زندگی پاکر یہاں کے ذرے ذرے میں رقصاں ہے۔ ذرا کان دھر کے سنیئے تو اس قدیم شہر کا ہر ہر پتھر اور ہر ہر سنگریزہ آپکو اس لازوال محبت کی داستان سنائیگا۔ اسکی عظمت و پاسداری کا یہ عالم ہے کہ آپ مدینہ میں جابجا اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکتے ہیں۔ البتہ اُسے الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھال سکتے۔

(روڈ ٹولکھے)

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

سیرت، ہجرت و فتح کے آئینہ میں

(حبیب ریحان ندوی تسنیم مصر)

یکم محرم الحرام کو ہجری سال نو شروع ہوتا ہے۔ یہ سال ہجری کیا ہے؟ اور ہم کو کس چیز کا درس دیتا ہے؟ ۔ یہ سال نو ہم کو عزم و ہمت، جوش و استقامت، علم و عمل، یقین و ایمان کا سبق سکھاتا ہے اور یہ سوچنے پر اُبھارتا ہے کہ ہم غور کریں سال کی نسبت ہجری کی طرف کیوں ہے؟ اسلام کے اندر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر وفات تک کے بے شمار واقعات، غزوات، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش یا بعثت یا وفات سے سالِ نو کی ابتدا کیوں نہ کی گئی۔ اور اس ہجرت کے واقعہ کی طرف اس کی نسبت کیوں کی گئی ہے؟

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت کو تقریباً چار سال گزر چکے تھے۔ اب تک مسلمانوں کے لئے تاریخ کا کوئی حساب نہ تھا۔ بلکہ لوگ بڑے بڑے واقعات سے حساب لگاتے تھے۔ مثلاً عام فیل کے واقعہ کی طرف نسبت کرتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ واقعات اس قابل نہ تھے کہ ان کی طرف اسلامی تاریخ کی نسبت لگائی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنہ ۱۶ھ میں یہ سال ہجری مقرر فرمایا۔ اس واقعہ کی ابتدا مقریزی جلد اول میں اس طرح درج ہے کہ سنہ ۱۶ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک چک پیش ہوا جس پر صرف شعبان لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کس طرح معلوم ہو کہ گزشتہ شعبان کا مہینہ مراد ہے یا حال۔ حضرت عمر رضؓ نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر فوراً مجلس شوریٰ کا جلسہ منعقد کیا۔ اور تمام اکابر صحابہ کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ اکثر لوگوں نے رائے دی کہ فارسیوں کی تقلید کی جائے۔ خوزستان کا بادشاہ ہرمزان جو اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ ہی میں مقیم تھا بلایا گیا اس نے کہا کہ ہمارے ہاں کے حساب کو ماہ و روز کہتے ہیں۔ اور اس میں مہینہ اور تاریخ دونوں کا ذکر

سہ روزہ دعوت دہلی نبی خصوصی پیشکش

ذکر ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ بحث ہوئی کہ سنہ کی ابتدا کب سے کی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ ہجرت نبوی سے سنہ شروع کیا جانا چاہیئے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت ربیع الاول میں فرمائی ہے اور اسلامی سال تو محرم سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں نیا سال محرم سے شروع ہوتا تھا اس لئے حضرت عمر نے سال کو تقریباً دو ماہ پیچھے ہٹا کر اس کی ابتدا محرم ہی سے رکھی۔

وجہ خصوصیت

بہر حال غور کرنے کا مقام ہے کہ ہجرت کا واقعہ اپنے اندر کونسی اہم خصوصیات اور انفرادیت رکھتا ہے اور ہم کو ہر سال کن چیزوں کی نصیحت کرتا ہے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا محبوب وطن مکہ کیوں چھوڑا؟ اللہ کے محبوب و پاک گھر کی زیارت سے کیوں اپنے کو محروم کیا؟ کونسی وہ تڑپ اور لگن تھی جس نے آپ کو ہر چیز کی قربانی کے لئے ابھارا؟ اور کونسی وہ کامیابی و کامرانی اور نجاح و فلاح تھی جو ہجرت کرنے کی وجہ سے آپ کو ملی؟ اور خدا کی راہ میں اس ہجرت کے طفیل سے اسلام کی نشر و اشاعت کے کیا کیا وسائل پیدا ہوئے؟ ۔ ان تمام سوالات کے جواب دینے کے لئے ہجرت کے پس منظر اور حالات پر اجمالی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس سے جو دعوت لے کر تشریف لائے تھے اس کو آپ نے عام فرمانا شروع کیا۔ اور اس کی خاطر قریش مکہ کی تمام تکالیف جھیلیں۔ آپ کے عزم و ہمت، صبر و یقین کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ تیرہ برس ایک ایسے ماحول میں تبلیغ دین کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے جو بالکل مخالف تھا۔ کافروں نے آپ کو ستایا، پریشان کیا، جسمانی ایذادی، روحانی کوفت پہنچائی۔ لیکن آپ اپنے عمل سے باز نہ آئے۔ کیونکہ نگاہِ بصیرت سے اس کی صداقت آپ پر واضح اور عیاں تھی۔

اہل مکہ سے عاجز ہو کر آپ قرب و جوار کے مقامات پر تبلیغ دین کے لئے جاتے اور مایوسی سے اکتاتے نہیں۔ بلکہ ہر مایوسی آپ کے لئے عزم و ہمت کا ایک جدید سبق بن جاتی۔ اور ہر یاس کے جلو میں آپ آس کا جلوہ دیکھ لیتے۔ جو قبائل باہر سے موسم حج میں آتے۔ آپ ان سے ملتے اور ان کے سامنے اپنی بات رکھتے۔ بعض کے دل میں اللہ تعالیٰ ڈال دیتا اور وہ آپ کی بات سن لیتے اور بعض فرعون

سے سامان غرور وتکبر کے نشہ میں چور ہوکر انکار کر دیتے ۔

قریش مکہ نے آپ پر مال وزر کی پیش کش کی۔ آپ سے کہا کہ تم اگر چاہو تو تم کو سردار بنا دیں، تم جس خوبصورت لڑکی سے چاہو تمہاری شادی کر دیں لیکن آپ جس پیغام کو لے کر تشریف لائے تھے اور جس کا نشر کرنا آپ پر فرض تھا اس کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ آپ نے عاشقانہ اور والہانہ لہجہ میں پورے عزم وہمت کے ساتھ فرمایا۔ کہ اگر سورج میرے سیدھے ہاتھ میں اور چاند میرے بائیں ہاتھ میں رکھدیا جائے تب بھی میں اس دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں ۔

اُمید کی کرن

دن گزرتے جا رہے تھے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مانوس گوش ہوتی جا رہی تھی۔ آپ ہر حج کے موسم میں اسلام کی دعوت دیتے تھے اور اس طرح جزیرۂ عرب میں آپ کی بات پھیل رہی تھی۔ آپ حج کے موسم میں یثرب (مدینہ) کے ایک وفد سے ملے اور اس کو اللہ کا کلام سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے یہود سے نبی آخر الزمان کے حالات سن رکھے تھے۔ جو یہ تھے ۔

الرسول النبی الامی الذی یجدونہ	وہ نبی امی جن کا تذکرہ ان کے ہاں موجود ہے توراۃ
مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل	میں اور انجیل میں۔ ان کو اچھائی کا حکم دیتا ہے
یامرھم بالمعروف وینھاھم عن	اور برائی سے روکتا ہے اور ان کے لئے
المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم	اچھی چیزوں کو جائز کرتا ہے اور بری چیزوں کو
علیھم الخبائث	حرام کرتا ہے۔

انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی دعوت کو بالکل اس کے مطابق پایا اور ان کو کوئی شک وشبہ باقی نہ رہا۔ اور انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرلی جس کو بیعت العقبۃ الاولیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دعوت اسلامیہ کی کامیابی کا یہ وہ پہلا سنگ میل تھا جس کے بعد دعوت اسلامیہ اپنے محدود دائرے سے نکل کر آفاق کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ اس بیعت کو ابھی سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ صاف دل اور پاک باطن اہل مدینہ کا ایک وفد جو ۷۳ مردوں اور

دو عورتوں پر مشتمل تھا۔ رات کی تاریکی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوا۔ حضور ان کے پاس تشریف لے گئے اور دوبارہ بیعت ہوئی۔ اس کو بیعت العقبۃ الثانیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت ہوئی کہ اللہ کے سوا کسی کی پوجا اور بندگی نہ کریں گے اور یہ کہ آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور یہ کہ آپ کی مدد کریں گے اور آپ کی حفاظت اس طرح کریں گے جس طرح اپنی جانوں اور اولاد اور گھر والوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس وفد نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کی پیش کش کی کہ آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر آئیں۔ انشاء اللہ آپ وہاں اسلام کے لئے کافی گنجائش پائیں گے۔

کفار قریش کی اسلام دشمنی کا عجیب حال تھا۔ وہ نہ تو حضورؐ کی بات سنتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا آپ کی بات سنے۔ انہوں نے دعوت کی راہ میں ایک آہنی جال بچھا رکھا تھا اور یہ چاہتے تھے کہ حضور اس سے نکل کر بھی نہ جا سکیں کیونکہ اس وحدانیت کی دعوت سے انہیں خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح یہ مکہ ہی کے پہاڑوں میں گم ہو کر رہ جائے۔ اور باہر نہ جا سکے۔ لیکن دعوت کی راہ میں حائل شدہ ساری بندشوں کے باوجود بہر حال دعوتِ اسلام کے نطاق میں وسعت ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کفار کی ساری کوششوں پر پانی پھر رہا ہے۔ اور بہر حال وحدانیت کا قمر اور اسلام کا یہ شمس نمایاں اپنی نورانی شعاعوں سے معمورۂ جہاں کے شش جہت کو منور کرنا چاہتا ہے۔

کفارِ مکہ کی پریشانی کا حال یوں ہی کیا کم تھا کہ جب انہوں نے یہ سنا کہ مدینہ کے اندر آپ کی دعوت کو امن مل گیا ہے اور بعض لوگ ہجرت بھی کر گئے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانے والے ہیں۔ اور اہلِ مدینہ نے اس بات کا عہد کر لیا ہے کہ آپ کی حفاظت جان و مال اور اولاد و عیال سے زیادہ کریں گے۔۔ اس خبر سے کفارِ مکہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور وہ سراسیمہ و پریشان ہو گئے اور ان کو نظر آنے لگا کہ ہماری اور عزت پر آہنی ضرب لگنے کا وقت آگیا۔ اور ان کا فولادی شکنجہ عزم و ہمت اور قوت و ارادہ کے سیلِ رواں کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہونے والا ہے۔ اور اگر محمد مکہ سے نکل گئے تو وہ اپنی دل موہ لینے والی باتوں، ہنستے چہرے اور اثر کرنے والی دعوت کے ذریعہ سے ضرور پورے عرب پر چھا جائیں گے اور پھر ہم کو حسرت و نا کامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

اس سخت مسئلہ کو حل کرنے کی کیا تدبیر کی جائے؟ اس بلا سے کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا جائے؟ یا جانے دیا جائے؟ یا (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے۔ کس طرح اس نئی دعوت کو ختم کیا جائے جس کی پکار یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

یہ بھی کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ ہم اپنی پرانی تقلیدوں کو چھوڑ دیں۔ اپنے باپ دادا کی پیروی کو ترک کر دیں۔ اپنے بے شمار معبودوں کے روبرو جھکنے اور ان کی عبادت کرنے کی بجائے صرف ایک خدا کی اطاعت و غلامی پر قناعت کرلیں۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات تھے جو قریش کے تمام سرداروں اور اکابر کے دل میں مہینوں بلکہ برسوں سے آ جا رہے تھے لیکن اب ان خیالات میں زور، اور ان کے حل کرنے کی سب میں بے چینی اور اضطراب کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ اور ہر ایک اپنی انفرادی کوشش اس دعوت کے مٹانے کے لئے کر چکا تھا۔ اس لئے اب ہر ایک چاہتا تھا کہ کوئی ایسی اجتماعی کوشش کی جائے جس سے اس دعوت کے خاتمہ کا سامان فراہم ہو۔ ان کی صلح پسندانہ پالیسی بے کار ہو چکی تھی۔ ان کی مال و زر کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی۔ ان کی تمام کوششیں سراب کی طرح بے اثر ہو چکی تھیں۔ اب ابوطالب بھی زندہ نہیں تھے جو آپ کی ظاہری مدد کرتے اس لئے اب انتقامی جذبہ سب میں کارفرما تھا اور اس مصیبت

؎ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

سے نجات کا حل ہر ایک سوچ رہا تھا۔

مشاورتی کونسل کا اجلاس

قریش کے اکابر کے مشورہ سے قریش کے دار الندوہ (پارلیمنٹ) میں مشاورتی کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا جس کے تمام ممبران چالیس برس سے زیادہ عمر کے ہوتے تھے۔ اور جس میں ہر قبیلہ کی۔ نمائندگی قبیلہ کا سردار یا حاکم یا کوئی شریف اور بڑا شخص کرتا تھا۔

بزم مشاورت قصی بن کلاب کے گھر میں قائم ہوئی کیونکہ یہی اس زمانہ میں پارلیمنٹ ہاؤس تھا قریش کے قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اپنے قبیلوں کی نمایندگی کرنے کے لئے موجود ہیں۔ بنی عبد شمس کی نمائندگی عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کر رہے ہیں۔ بنی امیہ کی ابوسفیان۔ عبد مناف کی طرف سے طعیمہ بن عدل جبیر بن مُطعم، حارث بن عامر۔ عبد دار کی طرف سے نضر بن حارث بن کلدہ۔ بنی اسد بن عبد العزیٰ کی طرف سے ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، حکیم بن حزام۔ بنی مخزوم کی طرف سے ابوالحکم بن ہشام۔ بہرحال قریش کے تمام قبائل کی نمائندگی موجود تھی اور سب کے سب غرق تفکر تھے اور مجلس پر ایک عالم سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایجنڈا طلب کیا گیا۔ جو زبانی پیش ہوا۔ ایجنڈے کے الفاظ تقریباً یہ تھے۔

" آج کی مجلس کا مقصد بہت اہم ہے اور ایک سخت بات ہے جس نے تمام قریش کو بے چین و مضطرب بنا رکھا ہے۔ تمام عقلاء و حکماء کو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پریشان کن حالت کا کوئی نفع بخش حل نکالا جائے۔ اور کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سانپ مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کا معاملہ آج کی کونسل میں مشورے کے لئے زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ محمدؐ کی دعوت کو شروع شروع میں ہم لوگ ڈھیل دیتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ یہ شاعرانہ ترانے ہیں یا مجنونانہ گیتیں۔ جن کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ محمدؐ نے چھپ کر دعوت دیتے دیتے اب علانیہ اپنی دعوت کا اعلان شروع کر دیا۔ حد کر دی کہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ ایک خدا کی دعوت ہمارے سامنے دینے لگے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہنے لگے۔ ہم نے اس کے جواب میں

ظلم وستم کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ راہ روک دی کھانا پینا بند کر دیا۔ تعلقات ختم کر دیئے۔ جو ستم ڈھا سکتے تھے وہ مسلمانوں کے جسموں پر ڈھائے۔ جتنی روحانی تکلیف پہنچا سکتے تھے انہیں پہنچائی۔ مگر ہماری یہ ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔

ہم نے دوسری صورت اختیار کی۔ محمد کو حرص وطمع دی۔ نعمتوں اور مسرتوں کے حسین و جمیل خواب دکھائے۔ مال و زر کے انبار کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ سرداری کی پیش کش کی۔ نوجوان دوشیزاؤں اور پیکر حسن نازنینوں کی طرف ان کے رُخ کو موڑنا چاہا مگر وہ کسی بھی قیمت پر اپنی دعوت کو فروخت کرنا نہیں چاہتے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اگر سورج میرے داہنے ہاتھ میں اور چاند بائیں ہاتھ میں رکھ دو تب بھی میں باز نہ آؤں گا۔ مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ مجھے اللہ نے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے اور میں تم کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں۔

ہم نے پھر پینترا بدلا۔ اور محمد کے ساتھیوں کو زیادہ ستانا شروع کر دیا تو وہ حبشہ ہجرت کر گئے یہ بھی ہمارے لئے فائدہ مند نہ ہوا۔ بلکہ اُلٹا غضب ہو گیا۔ انہوں نے محمد کے نام کا کلمہ سارے حبشہ والوں کو سُنایا اور مکہ سے باہر ان کی بات اور دعوت مقبول ہونی شروع ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محمد حج کے موسم میں تمام قبیلوں کو اپنی درد بھری کہانی اور دعوت سناتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جو اُن کی بات سُنتا ہے اثر لے کر واپس جاتا ہے۔ اور اب تو پریشان کن حد تک معاملہ پہنچ گیا ہے۔ مدینہ کے قبیلہ اوس وخزرج نے ان کی دعوت مان لی ہے اور ان کی طرف سے دفاع کا عہد کیا اور ان کی حفاظت کا پیمان باندھا۔ اور اس کے بعد سے تھوڑے تھوڑے مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اور ہو نہ ہو ایک دن محمد بھی ہجرت کر جائیں گے پھر کیا ہوگا۔؟ محمد کی دعوت عام ہو جائے گی۔ ہماری سرداری وعزت کے پرزے پرزے اُڑ جائیں گے۔ اوس اور خزرج جنگ کے ماہر اور بہادر لوگ ہیں۔ اُن کے ہمراہ وہ بہادرانِ قریش جو اسلام لا چکے ہیں مل جائیں گے اور ہماری دینی، فکری، اقتصادی اور تجارتی راہیں مسدود کر دیں گے۔ ہماری زندگیوں کا دارومدار تجارت پر ہے۔ اور اس طرح ہم مر جائیں گے۔

ــــ روزنہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

قریش کی تجویزیں

تمام مدبرین و مفکرین غرقِ تفکر ہو گئے۔ پھر تمام لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ بعض اہم رائیں یہ ہیں۔

ابوالبحتری بن ہشام نے کھڑے ہو کر کہا کہ۔ محمد کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر گھر کے اندر بند کر دیا جائے تاکہ ان کو بھی وہی پیش آئے جو اُن سے قبل کے شعراء نابغہ و زہیر کو پیش آچکا ہے۔ لیکن اس رائے کو سب نے متفق طور پر نا پاس کر دیا اور کہا یہ ناممکن ہے کیونکہ محمد کے ساتھی ان سے عشق رکھتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ان کو چھڑا لیں گے۔ اور نہ بھی چھڑائیں تب بھی ان کی دعوت قیدخانے کے اندر سے عام ہوگی۔

ابوالاسود ربیعہ بن عامر نے کھڑے ہو کر دوسری رائے پیش کی اور وہ یہ ہے کہ ان کو ہم لوگ اپنے سامنے جلاوطن کر دیں تاکہ اس جھنجھٹ سے چھٹکارا ہو۔ جہاں ان کا جی چاہے جائیں اور جو چاہیں کریں ــــ لیکن یہ رائے اور بھی زیادہ غیر موزوں معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس طرح تو دعوت اور بھی عام ہو جائے گی اور اسی سے سارے قریش والے ڈر رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا تم محمدؐ کی میٹھی گفتگو، نرم بات، شیریں زبان، بہترین اخلاق لوگوں کے دلوں پر اُن کی جاذبیت نہیں دیکھتے؟ اگر تم ان کو نکال دو گے تو سارا جزیرہ عرب ان کے کلام کی حلاوت سن کر ان کا مُرید ہو جائے گا۔ اور پھر ان سب کو لے کر وہ تم کو اور تمہارے شہر سب کو فتح کر لیں گے۔ اس رائے پر سب کے سب لوگ غیر متفق تھے۔ اس لئے یہ رائے بھی مہمل قرار دی گئی۔

اس کے بعد ابوالحکم بن ہشام کھڑا ہوا اور کہا کہ میں نے جو رائے سوچی ہے وہ سب سے صائب اور مفید ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قریش کے ہر ہر قبیلے سے ایک ایک بہادر نوجوان کو لیں اور ہر ایک کو ایک ایک تلوار دے دیں۔ اور وہ سب کے سب مل کر محمد کو قتل کر دیں۔ اس طرح کہ ایک ہی وار سب مل کر کریں۔ اس طرح یہ ہوگا کہ بنو عبد مناف اکیلے سارے قبیلوں سے خون کا بدلہ نہ لے سکیں گے۔ اور وہ سب سے کس طرح لڑائی مول لے سکتے ہیں۔ بالآخر ان کو دیت دے دی جائے گی۔ اس رائے پر صدائے مرحبا و آفریں بلند ہوئی۔ اور سب نے بیک زبان

اس قرارداد کو پاس کر دیا۔ کاش! وہ نادان جانتے کہ جس وقت وہ اس قرارداد کو پاس کر رہے تھے تو وہ انسانیت کے خون کے درپے تھے۔ اور وہ ان اخلاقِ فاضلہ اور ان مثالی قدروں کو فنا کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے جو عرصۂ عالم کا سب سے گرانمایہ اور اپنے وجود کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تھیں۔ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ ناکامی و نامرادی ان کے ہی حصہ میں ہے اور فتح اور کامرانی اس نبی امی کے حصہ میں۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ؎

بالآخر کاروانِ رنگ و بو گرمِ سفر ہوگا
شمیمِ گل کو کیا روکے گی دیوارِ چمن ساقی

سرزمین پاک سے جدائی

کفار نشۂ غفلت میں سرشار تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے اس خفیہ مشاورتی جلسہ اور اس کی قرارداد کی خبر محمد تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے اور اللہ کے رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی تمام ریشہ دوانیوں کی اطلاع دے دی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک	اور جب مکر کر رہے تھے کافر کہ باقی رکھیں آپ کو
او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون	یا قتل کر دیں یا نکال دیں۔ اور وہ سب مکر کر رہے
ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔	تھے اور اللہ ان کے مکر کا جواب دے رہا تھا
	اور اللہ مکر کرنیوالوں کو بہترین جواب دینے والا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا کیونکہ جس خدائے بزرگ و بالا کے اختیار و اقتدار میں روئے عالم کا ذرہ ذرہ اور شجر ہستی کا پتہ پتہ ہے اُس نے آپ کی مدد اور کامیابی کا وعدہ کیا ہے۔ صحابہ کرام ہجرت کرتے چلے جارہے تھے۔ لیکن ابھی تک دربار خداوندی سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کی تیاری کر رہے تھے لیکن دربار نبوی سے ان کو حکم مل رہا تھا کہ انتظار کرو ساتھ ہی چلیں گے۔ وہ اکیلے کیسے چلے جاتے۔ ان کی قسمت میں یہ بڑا شرف ہمیشہ ہمیش کے لئے لکھا جانے والا تھا۔ بالآخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی اجازت مل گئی اور آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ میں چھوڑ دیا تاکہ وہ امانتوں کو واپس کردیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ شخص جس کے سب سب دشمن ہیں اور اس کی جان کے درپے ہیں۔ اُس کے اخلاق و کردار اور امانت داری کا یہ حال ہے کہ دشمن تک اس کے پاس امانتیں رکھواتے ہیں۔

اس منظر کا تصور کیجئے جب رسول خدا ﷺ نے اپنے وطن اور گھر کو خیرباد کہا۔ اور مجبوری کے عالم میں مکہ کو چھوڑا۔ اس سرزمین پاک کو چھوڑا جس کے ذرہ ذرہ سے عشق و محبت کی بو آتی تھی۔ اس محبوب گھر کعبۃ اللہ کو چھوڑا جو صفحۂ ہستی پر سب سے مبارک اور سب سے محبوب گھر تھا۔ اس تأثر و تعلق کے آئینہ دار وہ الفاظ ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جدائی کے وقت بیت اللہ پر نظر ڈالتے ہوئے فرمائے تھے۔

واللہ انک لاحب ارض اللہ الی	اللہ کی قسم تو میرے نزدیک اللہ کی سب سے محبوب زمین ہے
وانک لاحب ارض اللہ الی اللہ	اور اللہ کی سب سے محبوب زمین ہے اللہ کے نزدیک
ولولا ان اھلک اخرجونی ماخرجت منک	اور اگر تیرے اندر بسنے والے لوگ مجھ کو نہ نکالتے تو میں ہرگز نہ نکلتا۔

وہ کفار قریش جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل و حرکت پر پہرہ لگائے بیٹھے تھے ان کی نگاہوں میں خاک جھونکتے ہوئے آپ نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ دیا۔ آپ کے ساتھ رفیق سفر حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ احتیاطی تدابیر کی بنا پر تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے۔

حسرتناک منظر کفار قریش کو خبر لگی کہ آپ ہجرت کر گئے تو ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سارے کے سارے متحیر و پریشان ہو گئے اور آپ کی تلاش لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ آپ کو زندہ یا مردہ لانے پر بڑا بھاری انعام مقرر کیا گیا لیکن جس کو اللہ رکھا اسکو کون چکھے۔ جس کی مدد و نصرت کا وعدہ خالقِ کون و مکان نے کیا ہو اس کا کون بال بیکا کر سکتا ہے۔ غار ثور کے منہ پر کفار کی ایک ٹولی آگئی اور اتنی قریب آگئی کہ اگر ذرا سا جھک کر دیکھ لیتے تو آپ دکھ جاتے۔ یہ وہ دشوار اور سخت موقع تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی کی بشریت یہاں جلوہ گر ہو گئی اور وہ پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن ایثار و اخلاص کا کمال دیکھئے کہ یہ گھبراہٹ و پریشانی اپنی جان کے واسطے نہ تھی بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھی کہ خدانخواستہ ہدایت و نور کی اس شمع جہانسوز کو یہ دشمنِ جان و ایمان گل نہ کر دیں۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر قائم تھے اور نصرتِ الٰہی کا آپ سے وعدہ ہو چکا تھا۔ آپ اطمینان و سکون سے تھے اور حضرت ابوبکر کو اس طرح دلاسہ دے رہے تھے ماظنك باثنين الله ثالثهما لا تحزن ان الله معنا۔ ابوبکر اُن دو کے بارے میں تمہاری کیا رائے جن کا تیسرا خدا ہے ۔

محمد اللہ تو ہے جس کا ہمدم
کہاں اُس قلب میں گنجائشِ غم

قرآن پاک نے بھی اس واقعہ کی طرف اس طرح نشاندہی کی ہے۔

الا تنصروه فقد نصره الله اذ	اگر تم نے اس کی مدد کی تو اللہ نے اس کی مدد
اخرجه الذين كفروا ثاني اثنين اذ	کی جب کہ اس کو اس کی قوم نے نکال دیا۔ وہ دو
هما في الغار اذ يقول لصاحبه	میں کا ایک تھا غار میں۔ جب وہ کہہ رہا تھا اپنے
لا تحزن ان الله معنا	ساتھی سے ڈرو نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

خدا نے جو مدد کا وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ کفار قریش کی نگاہوں میں دھول پڑ گئی۔ ان کی

عقلوں نے ان کو دھوکا دیا۔ اور وہ غار کے اندر نہ دیکھ سکے اور مایوس و ناکام ہو کر واپس چلے آئے لیکن ان کے دل میں شرم و عار اور حسد و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ انہوں نے اس بات کا اعلان اور زیادہ زور سے شروع کیا کہ جو محمد کو پکڑ لائے اس کو سو اونٹ دیئے جائیں گے۔ عرب کا ریگستانی علاقہ اور چودہ سو برس قبل سو اونٹ ـــ صحرائے عرب میں یہ انعام کسی طرح سو ماڈرن موٹروں سے کم نہ تھا۔

مہاجر کا امان نامہ

انعام کا لالچ میں بے گنتی لوگ آپ کی کھوج میں گھوم رہے تھے۔ آپ نے تین دن غار ثور میں قیام فرمایا۔ پھر مدینہ کی راہ لی۔ جانثار حضرت ابوبکرؓ کا یہ حال تھا کہ کبھی آپ کے آگے چلتے۔ کبھی برابر چلتے، اور کبھی پیچھے چلتے۔ سراقہ بن جعشم نے آپ کو دیکھ لیا۔ اور اس انعام کی لالچ میں گھوڑے کو دوڑاتا ہوا قریب لایا۔ گھوڑے کے پاؤں دھنس گئے۔ بار بار اس نے بدی کا ارادہ کیا۔ لیکن ہر بار وہ ناکام ہوا۔ بالآخر اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اس معاملہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور یہ محمدؐ کی طاقت نہیں بلکہ کسی ایسے بڑے کی طاقت ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ واپس جانے لگا تو اس نے چلتے وقت یہ کہا کہ حضورؐ مجھ کو ایک امان نامہ لکھ دیجئے تاکہ جس وقت آپ کا غلبہ ہو جائے اور آپ کے جانثاروں سے سارا جزیرہ عرب بھر جائے تو اس وقت مجھ کو اس جرم میں کوئی سزا نہ دے۔ رحمۃ للعالمین کی رحمت پہ قربان جایئے آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ امان نامہ لکھ دو۔ اللہ اللہ کس شان کا مہاجر تھا یہ۔ اور کس رعب جلال کا مالک تھا اپنے گھر بار کو چھوڑنے والا نہتا سا

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

جمال و جلال کی ایسی دل آویز حکایت کہیں آپ نے سنی، یا دیکھی یا پڑھی ہے ـــ؟

تاریخی دن

دعوتِ اسلامیہ کے فروغ و نشاط کے لئے قسام ازل نے جو سرزمین پاک منتخب کی تھی وہ تھی مدینہ طیبہ کی زمین۔ یہیں سے آفتاب ہدایت کی

ضیا باری ہوئی اور سارے عالم میں اس کی ضو فگن شعاعوں نے اُجالا پھیلا دیا۔ اس سرزمین پاک کے پاک بندے جن کے دل اسلام کی طرف مائل ہو گئے تھے اور جنہوں نے حضور کو ہجرت کی دعوت دی تھی انکو جب معلوم ہوا کہ یہ آفتاب نبوت عنقریب اپنے وجود سے اس سرزمین کو تاباں کرنے والا ہے تو ان کی خوشی، جوش محبت اور فرط تعلق اور کیفیت انتظار کا وہ عالم تھا کہ اس کو بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس دن کی مسرت و خوشی کا کیا عالم بیان کیا جائے جس دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ طیبہ پہنچے۔ بچے بچیاں، مرد و عورتیں، بوڑھے جوان سب سرمست تھے اور خوشی کے گیت گا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی نعمت آ گئی ہے۔ اور اس میں کیا شک تھا۔ ایسی نعمت انکے پاس بھیج گئی تھی جو عرصۂ کائنات کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ جو معمورۂ ہستی کا سب سے نادر ہیرا تھا جو عالم وجود کا سب سے گرانقدر سرمایہ تھا۔ ہر ایک کے دل میں اس نئے مہمان کے لئے گنجائش تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کی نگاہوں کا تارا اور دل کا نور ہے۔ ہر ایک کے دل میں تڑپ تھی کہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

کاش یہ سراپا برکت ذات اس کے گھر میں مہمان ہو۔ اس محبت و تعلق اور جوش عقیدت کے درمیان آپ نے فرمایا کہ سواری کی لگام چھوڑ دو۔ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ جہاں یہ رک جائے گی وہیں میں ٹھہر جاؤں گا۔ بخت و نصیبہ جاگ اٹھا حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا آپ کے مکان کے پاس جاکر اونٹنی رک گئی۔ حرم سے نکلی ہوئی دولت ان کے مکان میں جمع ہو گئی۔ قابل صد رشک ہے وہ خطہ زمین جہاں آپ نے پہلا قدم اتارا۔ اور لائق ہزار تہنیت ہے وہ مشت خاک جس کو آپ کی معیت نصیب ہوئی۔ آپ نے مدینہ میں اترنے کے بعد مسجد بنانے کے لئے زمین لی اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اس نو آبادی میں ایک خدا کا گھر بنایا۔

مثالی اخوت

ہجرت تاریخ انسانی کا ایک عبرت آموز واقعہ ہے۔ ہجرت کے دامن میں سینکڑوں واقعات پوشیدہ ہیں۔ معاشرہ اسلامی کی ذہنی و فکری اصلاح کے لئے جس طرح مکہ مکرمہ کی تیرہ برس کی مدت ایک نصاب تھا۔ اسی طرح یہ ہجرت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ کتنے لوگ ایسے تھے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔ کتنے ایسے تھے جنہوں نے مال و زر کے انباروں کو چھوڑا تھا اور تن تنہا صرف اپنا دین بچا کر چلے آئے تھے۔ یہ ہجرت خالص اللہ کے لئے اور دین کے نام پر ہوئی تھی۔ اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں اخوت کی بنیاد ڈالی۔ یعنی ہر انصاری کے ساتھ ایک مہاجر کو رکھ دیا۔ اور ان انصاریوں نے ایثار و تعلق اور ہمدردی و محبت کا وہ ثبوت پیش کیا ہے جو تاریخ کے صفحات پر آب زر سے لکھا ہوا ہے۔ اور جس کی نظیر انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے مکان اور مال و زر کے دو دو حصے کر دیئے۔ حتیٰ کہ جس کے پاس دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کی اس سے شادی کرا دی۔ ایثار و تعلق کے کتنے قصے اور دھندے ہم نے اور آپ نے تاریخ کے صفحات پر پڑھے ہیں اور کتنے دوسرے دین ہیں جن کا دار و مدار ایثار پر ہے۔ لیکن ایسی نادر اخوت اور بے نظیر بھائی چارگی کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

انصار و مہاجرین کی اس ایک اخوت کے ذریعہ کتنے وہ فکری، ذہنی اور اقتصادی مسائل

(باقی ۲۳۱ پر)

نبوی اصلاح کے چند نمونے

از:۔ محمد بہجۃ البیطار
ترجمہ
عمر افضل۔

علماء کی لکھی ہوئی قدیم و جدید کتب کا جس نے بھی اچھی طرح مطالعہ کیا ہے یا نبیٔ اعظم کی سیرت کے بارے میں سیر حاصل تحقیق کی ہے وہ اچھی طرح یہ جانتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں آنے والے سب سے بڑے مصلح تھے۔ اور کئی نسلوں کے گزر جانے کے باوجود یہ حقیقت دھندلی ہونے کے بجائے زیادہ روشن اور صاف ہو گئی ہے۔

اگر دنیا کے بڑے لوگوں کا ذکر ہو رہا ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سب سے زیادہ عظیم تھے اور جب نبیوں اور رسولوں کا تذکرہ ہو رہا ہو تو سارے نبیوں کے پیشوا اور سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے۔ آپ کی پرورش اس طرح ہوئی کہ آپ کے والدین زندہ نہ تھے اور اس دنیا میں یتیم تھے۔ لیکن آج تک دنیا میں ایسے باپ، ایسی مائیں، ایسے اُستاد اور ایسی اُستانیاں دیکھنے میں نہیں آئیں جو اتنے اچھے طریقے پر ایسی پاکیزہ تربیت دے سکیں۔ آپ بچپن ہی سے ایسے کاموں کے عادی رہے جو خیر و برکت کا موجب بن سکیں اور نیکیوں کے لئے اُبھرنے میں ممد و معاون ہوں۔

کاش کہ اس امت میں بھی ایسے لوگ ہوتے جن کی اگر خود اپنی اولاد نہ ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں یتیموں کی تربیت پر کمربستہ ہو جاتے۔ وہ نبی خاتم النبیین جن کی اپنی تربیت اور نشو و نما یتیمی کی حالت میں ہوئی اور جس نے خود بڑے ہو کر بہت سے یتیموں کی پرورش کی۔ اس لئے کہ اگر کسی یتیم کا کوئی باپ بن جائے تو وہ اسی امت کے لڑکے ہیں، اسی امت کے افراد ہیں اور وہ اسی کی طرف نظریں جماتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ تشریف لے گئے اور بصریٰ میں

روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی۔ بحیرا راہب نے ان کے چچا کو قسم دی کہ وہ آپ کو لے کر حجاز لوٹ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہودی کوئی مکر و فریب پھیلائیں اور آپ کو ان سے کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے یہ پہلی عربی موتمر تھی جو یہودیوں کے اسلاف اور ان کے مکر و فریب سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہوئی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہؓ بنت خویلد کے لئے تجارتی سفر فرمائے۔ ان سفروں میں آپؐ وقت نشاط کار اور امانت و دیانت کے لئے مثال بنے رہے اور آپ نے دوسرے تاجروں کے مقابلے نفع بھی خوب حاصل کیا۔ آپ نے اپنے شباب کی ابتدا میں جبکہ آپ کی صحت و جمال عروج پر تھا حضرت خدیجہؓ سے شادی کی۔ حالانکہ آپ ثیبہ تھیں اور عمر چالیس سال تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر کا پچیسواں سال پورا کر رہے تھے۔ اس عمر میں بھی آپ ایک کافی عمر کی بیوہ سے شادی کرنے کے باوجود عصمت وعفت اور استقامت کے لئے ضرب المثل رہے جبکہ حضرت خدیجہ اس سے پہلے شوہر اور بچوں والی ہو چکی تھیں۔ حضرت خدیجہ آپ کی پہلی بیوی تھیں اور آپکے بچوں کی ماں بھی۔ آپنے انکے ساتھ اپنی زندگی کے پورے ۲۵ سال گزارے اور اس دوران میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی۔

حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد آپنے سودہ بنت زمعہ کے ساتھ شادی کی اور ان کے ساتھ مکہ میں ۵۳ برس کی عمر تک رہے۔ اس عمر میں بھی آپ نے انکے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کیا۔ اسکے بعد آپنے کئی شادیاں فرمائیں جو امت مسلمہ کیلئے رشد و ہدایت کا موجب بنیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ (اور یاد کرو اللہ کی ان آیات اور حکمت کو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی رہی ہیں)

مدینہ میں آپ نے بیوہ اور یتیم اولاد والی کئی عورتوں سے زوجیت اور اجتماعیت کے مصالح کی بنا پر شادی کی۔ کچھ شادیوں کے اسباب خصوصی تھے اور کچھ کے عمومی جنکی ساری تفصیلات سنت نبوی کی قدیم اور جدید کتابوں میں موجود ہیں۔ ان ساری عورتوں میں سے صرف حضرت عائشہ ایسی تھیں جو مدینہ میں صرف نو برس کی تھیں جبکہ آپکی شادی ہوئی۔ اور آپ حضرت خدیجہ کی طرح اپنے شوہر کے ساتھ اخلاص

ومحبت اور وفا میں رہتی دنیا تک کیلئے ایک ضرب المثل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپکے ہمیشہ باقی رہنے والے معجزات میں سے ایک معجزہ بنکر زندہ رہیں۔ اور آپنے تفسیر و احادیث اور فتاوی و احکام کی بہت سی گتھیاں سلجھا دیں۔ آپ کی مسند، مسند امام احمد بن حنبل میں صفحہ ۲۵۳ پر موجود ہے۔ اس میں وہ ساری روایات موجود ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے۔

مسلمانوں نے مکہ میں ابن ابی ارقم رضہ کے مکان کو دعوت اسلامی کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کیا تھا اور کعبہ کے قریب ہی جاہلیت نے اپنا گڑھ ۔ دارالندوہ ۔ کو بنایا تھا۔ دعوت اسلامی کا مرکز اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ کفر و فجور کے مقابلے میں توحید کو غلبہ حاصل ہو۔ رذالت پر فضیلت کی فتح ہو اور باطل پر حق غالب ہو جائے۔

دارالندوہ اسلام کے خلاف سرکشی اور مکر و فریب کا مرکز تھا تاکہ رسول اللہ صلعم اور آپکے اصحاب مقدسہ رضوان اللہ علیہم کو جاہلوں میں ملا لینے کا کام آسانی سے انجام دیا جاسکے لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی۔ دعوت اسلامی نے دارالندوہ پر اور حق نے باطل پر فتح پائی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا تھا اور اس نے اُسے سچا کر دکھایا۔ اپنی راہ میں لڑنیوالے مجاہدین کو فتح نصیب کی اور اکیلے ساری مشرک فوجوں کو شکست دی ۔

بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے مصلح اور انبیا میں سب سے زیادہ مکمل تھے۔ انسانوں میں سب سے زیادہ عزت والے تھے اور اس قابل تھے کہ انسان ہمیشہ ان سے محبت کرے انکی اطاعت کرے اور انکے اُسوہ کی پیروی کرے۔

بقیہ سیرت ہجرت و فتح کے آئینہ میں ص ۲۲۶

کا حل ہو گیا جو دعوت اسلامیہ کو فوراً پیش آئے۔ انصار کے ایثار و تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قرآن پاک نے انکی تعریف میں جو الفاظ کہے وہ قیام قیامت تک انکے لئے فخر و عزت کا باعث ہیں ۔ والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون ۔ وہ لوگ جو پڑے ہوئے ہیں اپنے گھروں میں اور ایمان میں ان سے پہلے۔ محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کریں انکی طرف اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی حاجت اس چیز کے بارے میں جو انکو دی گئی اور ترجیح دیتے ہیں اپنی جانوں پر اگرچہ انکو تنگی ہو۔ اور جو بچ گیا نفس کی حرص سے پس وہی فلاح پانیوالے ہیں۔

الغرض دلوں کی طہارت و صفائی کا جو نسخہ حکیم الامت، سرور کائنات نے نکالا اسکے ذریعہ انصار و مہاجرین باہم ایسے شیر و شکر ہو گئے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

شمع رسالت کے پروانے

از مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ ۔ ہر شخص کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

"گل ناچیز" اگر ایک مدت گل کی ہمنشینی کرے تو "جمال ہمنشیں در من اثر کرد" کا دم بھرنے لگے۔ لوہا پارس پتھر سے چھو جائے تو سونا ہو جائے۔ قطرہ دریا میں مل جائے تو گویا خود بھی دریا ہو جائے پھر وہ جس کی صفت قرآن کریم میں "سراجًا منیرًا" بتائی گئی ہے جو خود سراپا نور ہے اور جس کے مبارک ہاتھوں میں نور کی قندیل بھی ہے جو بیک وقت دلوں کو ایمان کی روشنی یا دماغوں کو افکارِ صحیحہ کی تابانی اور نگاہوں کو ہدایت ربانی سے سرفراز کرتی ہے۔ اگر اس آفتاب عالمتاب سے کسب فیض کرنے والے "اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم" کے معزز القاب سے پکارے جائیں تو تعجب کیا ہے۔ ان میں کا ہر فرد آسمانِ ہدایت کا روشن ستارہ اور انسانی معاشرہ کا گوہر شب چراغ تھا۔ اگر یہ نفوسِ قدسیہ نہ ہوتے یا دوسرے لفظوں میں شمع رسالت کے یہ پروانے نہ ہوتے تو جن غلاموں کو آقا سے بُعدِ زمانی و مکانی تھا کس سے یہ سوال کرتے ؎

گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چون ست

سیاست و معیشت کے چہرے کو انہوں نے نکھارا، تہذیب و تمدن کی زلفوں کو انہوں نے سنوارا۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کی مثالیں انہوں نے قائم کیں، جہالت کی اندھیاری رسم و رواج کی تاریکی، کفر و شرک کی سیاہی، ختم کرنے میں آفتاب رسالت کے ساتھ ان ستاروں کے درخشاں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جانباز ساتھی نہ ہوتے

— روزنامہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

تو دنیا میں نظام حق کیونکر برپا ہوتا۔ اللہ کی آخری کتاب۔ زندگی کا مکمل ضابطہ، انسان کے دکھوں کا نسخہ شفا ہمارے ہاتھوں میں کیونکر پہنچتا؟ گلہائے حدیث اور حدیث گل سے ہم کیسے واقف ہوتے اور کون بتاتا کہ عاشقان رسول، اس کے متبعین، محبین صادقین اور رسول کے نام کا کلمہ پڑھنے والے یوں جیا کرتے ہیں۔ ع

بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

اس میں شک نہیں کہ قدرت بے شمار طریقوں سے اپنے ارادے پورا کر سکتی ہے۔ مگر صحابۂ رسول کی فضیلت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ چننے والے کی نظر انتخاب نے انہیں کو اس کا اہل پایا۔ نکہت جاں بخش کی امین ذات گل تھی مگر نکہت گل کو پھیلانے والی نسیم پیدا کی گئی۔ کبھی نسیم کو نکہت گستری کی اجازت دی گئی۔ کبھی تلوؤں کو بوئے گل میں بسنے کا شرف بخشا گیا۔ کتاب الٰہی یوں بھی بغیر کسی وسیلہ و ذریعہ کے پھیل سکتی تھی مگر اس کی عملی صورت کیلئے نمونۂ عمل درکار رہا۔ اُسوۂ حسنہ پر چلنے کی ضرورت کو محض ذوق سلیم پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کی اہمیت و ضرورت کے لحاظ سے اسکے لئے امر بھی فرمایا گیا۔ مگر ختم نبوت کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ نمونۂ محبوب بعد کو آنے والی نسلوں تک بھی اپنے انداز کامل میں پہنچایا جائے۔ اسکے لئے صحابہ کرام ہی موزوں ہو سکتے تھے اور قدرت نے انہیں کو چنا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ۔

دنیا میں خدا کا پیغام پہنچانے کیلئے بیشمار خدا کے برگزیدہ بندے آئے مگر ان کی دعوت و تحریک پر لبیک کہنے والے بس اسی قدر پیدا ہوئے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مگر محبوب دوجہاں پیغمبر آخر الزماں نے جب آخری بار خدائے واحد کی اطاعت و بندگی کا اعلان کیا تو اس کی سعی جمیل کا نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (قرآن)

چنانچہ حضور کے جاں نثاروں اور شمع رسالت کے پروانوں کا جب شمار کیا گیا تو غزوۂ بدر میں تین سو چودہ۔ حدیبیہ میں پندرہ سو۔ فتح مکہ میں دس ہزار۔ حنین میں بارہ ہزار۔ حجۃ الوداع میں چالیس ہزار غزوۂ تبوک میں ستر ہزار۔ اور جب آپ انتقال فرماتے ہیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد تھی (مجمع بحار الانوار)

دوسرے پیغمبروں پر آپ کو صرف یہی فضیلت نہیں ہے کہ آپ کے اصحاب کی تعداد سب نبیوں سے

زیادہ ہے۔ بلکہ آپ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ کے نور ہدایت نے جن ذروں کو منور کر دیا تھا وہ اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔ اور گم گشتگان راہ انہی ستاروں کی روشنی میں اپنی منزل مقصود کا پتہ لگا رہے ہیں۔

کتاب الٰہی کے اوراق میں۔ احادیث کے صفحات میں، تاریخ و سیرت کی کتابوں میں ان کے تذکرے ہیں۔ صرف تذکرے نہیں بلکہ دنیا والوں کیلئے انہیں مثال میں پیش کیا گیا ہے۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر انہیں یہ بقائے دوام کا خلعت نصیب ہوا۔ ان کا جواب تلاش کرنا ہو تو خود یہی کتابیں بتا دیں گی مگر ان سب کے خلاصہ اور لبّ لباب پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ دراصل خدا اور اس کے رسول سے لگاؤ، دلچسپی، عشق اور والہانہ شیفتگی تھی۔

محبت و شیفتگی کی بنیاد عام طور سے کسی نہ کسی وصف پر ہوتی ہے۔ حکماء کا قول ہے کہ محبت و شیفتگی کے محرکات تین ہوتے ہیں۔ کمال، جمال اور نوال۔ دنیا میں محبت کی جاتی ہے تو اس لئے کہ وہ صاحب جمال ہے اور جمال سے متأثر ہونا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ کسی سے عقیدت و احترام کا برتاؤ کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ کمال ہر انسان کو مرغوب ہے۔ کسی کی مدح و ثنا کی جاتی ہے تو اس لئے کہ اس پر اس کا احسان ہے اور احسان کے سامنے جھکنا شرافت کی شان ہے۔ حاتم سے لوگ محبت کیوں رکھتے ہیں اسلئے کہ انہیں جود و سخا پسند ہے۔ نوشیرواں عادل کا نام لوگ کیوں لیتے ہیں اسلئے کہ انہیں عدل و انصاف پسند ہے۔ دنیا رستم و اسفندیار کی داستانوں کو پڑھتی اور سر دھنتی ہے اسلئے کہ انہیں صفت مردانگی محبوب ہے۔ بیشمار لوگ سقراط و افلاطون کے نام کو پیار کرتے ہیں اس لئے کہ وہ علم و حکمت کے دلدادہ ہیں۔ سینکڑوں جالینوس و ابن سینا کے قدر دان و فریفتہ ہیں اس لئے کہ انہیں علاج معالجہ سے دلچسپی ہے۔ بہتیرے شکسپیئر و ہومر، فردوسی و سعدی، تلسی داس و بھرتری ہری کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسلئے کہ انہیں فصاحت و بلاغت، ادب و شاعری کا ذوق ہے۔ لیکن جو ذات اقدس "اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم" ہو۔ جو جمال و کمال و نوال تینوں اوصاف کا جامع ہو اور جس کی شان "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" ہو وہ ذات پاک جس کے حسن و جمال کا ترانہ سلیمان و داؤد نے گایا۔

ـــــ روزنامہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

جس کا مژدہ جانفزا موسیٰؑ و مسیح ناصریؑ نے سنایا جس کے خیر مقدم کے لئے کروبیان عالم صف آرا ہو گئے جس کے پیچھے ملائکہ آسمانی نے نگہبانی کے فرائض انجام دیئے۔ وہ قدسی صفات جس نے خشک میدانوں میں علم و معرفت کے دریا بہا دیئے۔ سنگلاخ زمینوں میں دانش و حکمت کے گہرہائے آبدار لٹائے۔ نبیوں میں رحمت کا لقب پانے والا۔ غریبوں اور محتاجوں کی مرادیں بر لانے والا۔ یتیموں اور بیکسوں کا رکھوالا۔ محنت کشوں اور غلاموں کا والی جس نے خود غرضوں کو محبت و اخوت کا درس دیا۔ جس نے دشمنوں کو اپنا جگر بند ٹھہرایا، غریبی و امیری کی تفریق اس نے مٹائی، دنیا سے رسم غلامی اس نے ختم کی، بڑے بڑے فرعونوں کو سرنگوں اور کجکلاہوں کو واژگوں کر دیا۔ جس کی تعلیم نے درندوں کو چوپانی، بھیڑیوں کو گلہ بانی رہزنوں کو جہانبانی، غلاموں کو سلطانی اور شاہوں کو اخوانی سکھائی۔ جو محبوب بھی ہے اور محمود بھی مصطفیٰ بھی ہے اور مرتضیٰ بھی۔ حبیب کبریا بھی اور حبیب عالم بھی، رسولوں کا سردار بھی ہے اور انسانوں کا تاجدار بھی ایسے مرکز محبت پر دل و جان سے فدا ہونا، اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنا، اس کے پیغام کو ساری دنیا میں پھیلانا اور اس کے دین کے غلبہ کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دینا عین کمال اور انسانیت کی معراج نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔؟

کتنے خوش نصیب اور مبارک تھے وہ نفوس پاک جنہوں نے اس جمال جہاں آرا کا نظارہ کیا۔ اس نوال سرمدی سے فیضیاب ہوئے۔ اور اس کمال محمدی پر نثار ہوئے۔ اردو کے ایک ہندو ادیب گوردت سنگھ دارا لکھتے ہیں۔

"جس کسی نے اُسے پریم کی انکھڑیوں سے دیکھا اسی کی تمنائے زندگی پوری ہو گئی۔ جس کی نگاہ شوق اس پر پڑ گئی اسے منہ مانگی مراد مل گئی جس بشر کو اس منموہن نے اپنا درشن دیا اس کے جنم بھر کا پاپ کٹ گیا" (رسول عربی)

کوچۂ محبت بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہر کسی کا کام نہیں۔ محبوب جتنا بلند و ارفع ہوتا ہے اسی قدر محبت کے مدارج بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ
اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ

سب لوگوں سے کہدو کہ اگر تم کو ماں باپ بیٹے
بیٹیاں، بہن، بھائی، زن و شوہر، قوم و قبیلہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ)

اور مال جو تم نے جمع کر رکھا ہے اور تجارت جس کے خسارے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور وہ محل جن میں بسنا تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے وہ سب پیارے ہیں خدا اور رسول سے اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے تب تو تم منتظر رہو کہ خدا تمہارے لئے اپنا کوئی حکم دے۔

اس آیت میں جن اشخاص و اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی طرف میلان انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اسی لئے ان کی نفی نہیں کی گئی مگر ہاں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ ان محبتوں سے بلند بھی ایک محبت ہے اور وہ محبت خدا اور اس کے رسول کی محبت ہے۔ اسی لئے ان تمام محبتوں کو اس محبت کا تابع ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس محبت پر نچھاور کر دینا چاہیئے۔ یہی وہ راز ہے جسے اس محبوب دوجہاں نے یوں فاش فرمایا ہے۔

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ (صحیحین)

کوئی شخص تم میں سے مومن نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسے رسول کے ساتھ ماں باپ، اولاد اور باقی لوگوں سے بڑھ کر محبت نہ ہو۔

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من اھلہ ومالہ (زرقانی)

کوئی مومن نہیں بن سکتا جبتک میں اس کے اہل اور مال سے زیادہ محبوب نہیں ہوتا۔

رسول کے فرمان کی تصدیق ان دلدادگان محبت اور شیفتگان رسول نے اپنے عمل سے جس طرح کی دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کے عاشقوں اور فدائیوں نے کیا کچھ مصائب و آلام برداشت نہیں کئے۔ کبھی آگ کے شعلوں اور گرم ریت سے تپائے گئے تو کبھی پتھر کی سلوں کو ان کے سینوں پر رکھا گیا۔ ماں باپ کو چھوڑا۔ کنبہ و خاندان کو خیرباد کہا۔ بیوی بچے سے جدائی اختیار کی۔ گھربار لٹایا اور عزیز جان کو رسول کے قدموں پر ڈال دیا۔ رسول کے دین کی سربلندی

کے لئے کس کس رنج و الم کو دعوت دینی پڑی۔ کن کن رسوائیوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اور کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلنا پڑے۔ عشق صادق ہو تو ایسا ہو کہ جب گلے میں رسیاں ڈال کر گھسیٹے گئے اور اور پوچھا گیا تو وہی محبوب دلنواز کا نام زبان پر تھا۔ جناب خبابؓ کو کافروں نے دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹایا یہاں تک کہ یہ کوئلے ان کی پیٹھ کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے۔ بلال حبشی رضؓ دوپہر کی جلتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے ہیں اور سینہ پر پتھر کی سل رکھدی جاتی ہے مگر عشق محمدی کا نشہ ہے کہ اترتا ہی نہیں۔ رسول ﷺ کی محبت کی راہ میں ابوفکیہہؓ کے گلے میں رسّی باندھی جاتی ہے اور زمین پر گھسیٹا جاتا ہے اور پھر ان کے سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا ہے۔ تکلیف کی شدت سے زبان نکل پڑتی ہے۔ مگر دعوئ عشق و محبت سے دست بردار نہیں ہوتے۔ عمار رضؓ جلتی ہوئی ریت کے فرش پر لٹائے جاتے ہیں اور ان کو پیٹا جاتا ہے۔ زبیر رضؓ کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتا ہے۔ سعید بن زید رضؓ کو باندھ کر لہولہان کیا جاتا ہے۔ عثمان غنی رضؓ کو زدوکوب کیا جاتا ہے مگر رسول خدا ﷺ کی صہبائے تند و تیز کا جو نشہ چڑھ گیا ہے اترتا ہی نہیں۔

محبوب دوجہاں کی کرامت دیکھئے جس انسان نے ایک مرتبہ اس کو نگاہِ شوق سے دیکھ لیا پھر وہ مشتاقِ نگاہِ غیر نہ رہا۔ جس کے دل کے نہاں خانے میں اس کی محبت کی شمع روشن ہو گئی پھر وہ بجھائے نہ بجھی۔ جس متوالے نے ساقئ کوثر کا جام پی لیا۔ اسرار فطرت کا سرمایہ دار بن گیا اور دنیا و آخرت کا تاجدار بھی ہے۔

غلام نرگس مست تو تاجدار انند

خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند

زید بن دثنہ کو لڑائی میں کفار پکڑ لیتے ہیں اور قریش چاہتے ہیں کہ انہیں خرید کر قتل کر دیں۔ جب ان کو پھانسی کے تختے پہ لے چلے تو ابو سفیان بن حرب نے ان سے کہا۔ زید تجھ کو خدا کی قسم ہے بتاؤ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بدلے میں محمدؐ کو پھانسی پہ لٹکا دیا جائے اور تم اپنے گھر پہ آرام کرو۔ لیکن بادۂ توحید کا سرشار اور خمخانۂ محمدی کا متوالا جواب دیتا ہے "کیا کہتے ہو میں تو یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ میری رہائی کے بدلے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھے" ابو سفیان نے یہ والہانہ جواب سنا تو حیران رہ گیا اور بے اختیار پکار اُٹھا۔ میں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا جو دوسرے سے ایسی محبت رکھتا ہو جیسا محمدؐ کے اصحاب محمدؐ سے کرتے ہیں" (رحمۃ للعالمین)

رسولِ خدا کے فدائی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسولؐ کی دعوت کا اعلان کیا تو ہر طرف سے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک نے زد و کوب کیا۔ حضرت ابوبکرؓ بے جان نعش کی طرح زمین پہ پڑے تھے ناک اور چہرے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ بنو تیم کے لوگ آتے ہیں اور ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے کفار کے ہاتھ سے چھڑا لیتے ہیں اور گھر لے جا کر بستر پر لٹا آتے ہیں۔ جب افاقہ ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے (اسد الغابہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صدقہ کا حکم دیا تو یہی حضرت ابوبکرؓ اپنا سارا اثاثہ اور مال لے کر پہنچ جاتے ہیں اور رسول کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا؟ حضرت صدیق جواب دیتے ہیں "اللہ اور اللہ کا رسول" ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیق کو خدا و خدا کا رسول بس (اقبال)

حضرت علی مرتضیٰ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہاری محبت کیسی ہوتی تھی؟ فرمایا خدا کی قسم حضور ہم کو مال و اولاد اور ماں باپ سے زیادہ پیارے تھے اور اس سے زیادہ محبوب جتنا ٹھنڈا پانی ایک پیاسے کو ہوتا ہے"

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش

سینکڑوں دلدادگان عشق ومحبت کے قصے پڑھے ہونگے لیکن شمع رسالت کے پروانوں کی دلسوزی وجاں گدازی اور ہی شان رکھتی ہے۔ احد کے معرکہ میں جب قریش کے تیغ زنوں نے آپ پر یورش کی اور مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں تو آپ نے آواز دی، کون مجھ پر جان دیتا ہے؟ اس آواز کا سننا تھا کہ دفعتاً سات انصاری نکل آئے اور ایک ایک نے جاں بازی سے لڑکر اپنی جانیں فدا کر دیں۔

اسی جنگ احد کا ذکر ہے کہ ایک انصاری خاتون کے باپ بیٹے بھائی، شوہر سب قتل ہو جاتے ہیں۔ وہ مدینہ سے نکلکر میدان جنگ میں پہنچتی ہے تو یہ نہیں پوچھتی کہ میرے باپ بیٹے، بھائی اور شوہر کا کیا حال ہے بلکہ پوچھتی ہے تو یہ پوچھتی ہے کہ بتاؤ شہنشاہ کونین کس حال میں ہیں، لوگوں نے کہا تیرا لخت جگر مارا گیا، تیرے بھائی کو قتل کیا گیا، تیرے باپ کو تہ تیغ کیا گیا، تیرے رفیق زندگی نے بھی جام شہادت نوش کیا اور تو ان میں سے کسی کے متعلق دریافت نہیں کرتی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بخیریت ہیں۔ بولی نہیں مجھے دکھا دو تو تسکین ہوگی۔ اتنے میں سرور عالم کے روئے زیبا پر نگاہ پڑجاتی ہے اور چہرہ فرط مسرت سے کھل اٹھتا ہے۔ بے اختیار پکار اٹھتی ہے، کل مصیبۃ بعدک جلل یا رسول اللہ، اگر آپ سلامت ہیں تو تمام مصائب ہیچ ہیں۔

دنیا کے ایک مذہب کو صرف ایک سولی پر ناز ہے لیکن دیکھو اسلام میں کتنی سولیاں، کتنے مذبح اور کتنے مقتل ہیں۔

سہ روزہ دعوت دہلی کی خصوصی پیشکش